إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

نومبر ۲۰۲۰ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

CPL No. 296 November 2020

ڈاکٹر محمد امین کی نئی فکر انگیز تصنیف

پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟

ایک فکری تجزیہ

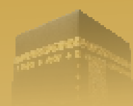

- موجودہ دینی جدوجہد کے غیر مؤثر ہونے کے مظاہر، اسباب اور نتائج
- بگاڑ کے اسباب اور ذرائع
- تفکیرِ نو اور تشکیلِ نو کے بنیادی اُصول اور تجاویز
- پس چہ باید کرد (ایک ہمہ جہت اصلاحی تحریک کی ضرورت)

صفحات: ۲۴۰ قیمت: ۳۰۰ روپے

مکتبہ البرہان

A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

فون: 0309-4607124، ای میل ermpak@hotmail.com

ڈاکٹر محمد امین کی مرتبہ نئی کتاب

اسلامی علوم میں تحقیق

اصول، ترجیحات اور معیار

* اسلامی تحقیق کے اصول
* اسلامی تحقیق کی ترجیحات
* اسلامی علوم میں جامعاتی تحقیق کی زبوں حالی
* جامعاتی تحقیق کا عمومی زوال

ڈاکٹر صاحب کے طبع زاد مضامین کے علاوہ ڈاکٹر محمد رفیع الدینؒ، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، سید سعادت اللہ حسینی، ڈاکٹر محمد الغزالی، ایس ایم محمد ادریس (ملائیشیا)، سید خالد جامعی، ڈاکٹر طفیل ہاشمی، ڈاکٹر معین الدین عقیل، ڈاکٹر پرویز ہود بھائی اور پروفیسر ملک محمد حسین کی نگارشات

صفحات: ۲۸۸ قیمت: ۳۰۰ روپے

مکتبہ البرہان

A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور، **0309-4607124**

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

	قیمت
❁ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۶۰۰ روپے
❁ اسلامی سکول کے خدوخال	۱۵۰
❁ تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	۳۰۰
❁ یکساں قومی نصاب۔خدشات و مضمرات	۲۵۰
❁ تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۲۵۰
❁ تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت۔ ہینڈ بک و گائیڈ	۳۰۰
❁ تدریس القرآن ① برائے معلمین	۲۰۰
❁ تدریس القرآن ① برائے طلبہ و طالبات	۱۰۰
❁ پنج سورہ (اُردو تفہیم، ڈاکٹر محمد امین)	۱۰۰
❁ ہمارا دینی نظام تعلیم	۴۵۰
❁ نصابِ مدنیؒ	۸۰
❁ مدرسہ ڈسکورسز۔مطالعہ و تجزیہ	۲۵۰
❁ اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۱۲۰۰
❁ حقیقتِ تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۸۰
❁ ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۳۵۰
❁ مسلم نشاۃ ثانیہ۔اساس اور لائحہ عمل	۴۷۵
❁ اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۳۵۰
❁ اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۲۵۰
❁ اسلام اور ردِّ مغرب	۳۰۰
❁ عصرِ حاضر میں دین کا متوازن تصور	۱۷۰
❁ شاتم رسول کے قتل کی شرعی حیثیت	۵۰

مکتبہ البرھان، 97-A نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور، **0309-4607124**

ماہنامہ البرہان لاہور

جلد ۲۴، شمارہ ۱۱، نومبر ۲۰۲۰ء/ ربیع الاوّل ۱۴۴۲ھ

مشمولات

O تعلیم و تربیت

- معاشرے میں تعمیری تبدیلی کیسے لائی جائے؟ رجال کار کی تیاری کے لیے ایک تعلیمی منصوبہ — پروفیسر ملک محمد حسین — ۵
- اکیسویں صدی اور ہمارا فرسودہ امتحانی نظام — ڈاکٹر شاہد صدیقی — ۹
- دینی مدارس کے وفاقوں کے قائدین کی خدمت میں — ادارہ — ۱۳

O اسلام اور پاکستان

- عصر حاضر میں ریاست مدینہ کا احیاء کیسے ممکن ہے؟ — ڈاکٹر محمد امین — ۱۶
- پاکستان میں سیکولرزم کی پیش قدمی — پروفیسر ملک محمد حسین — ۳۳
- کیا مجرا ہماری معاشرتی روایات کا حصہ ہے؟ — محمد عاصم حفیظ — ۳۹

O تفہیم مغرب

- جدید ٹیکنالوجی کے تباہ کن اثرات — ڈاکٹر سید حسین نصر — ۴۲
- سیاسی، معاشی اور عسکری دہشت گردی وبدمعاشی کے باوجود مغرب 'مہذب' ہے — شاہ نواز فاروقی — ۴۶

O تبرۂ کتب

- آدابِ اختلاف (اتحاد امت کا قابل عمل راستہ) از ڈاکٹر اختر حسین عزمی — ملک شفقت حیات — ۵۰
- 'پاکستان کی دینی قوتیں ناکام کیوں؟' پر تبصرے جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت کے احباب سے مکالمہ — مدیر — ۵۲

O داستان سرائے

- ایک تھا ثمامہ — ادارہ — ۵۶

O ایک لوہار کی

کیا اس ملک میں اسلام کا کوئی والی وارث ہے؟ — عبداللہ — ۵۸

تُو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر

ور حسابم را تو بینی ناگزیر
از نگاہِ مصطفیؐ پنہاں بگیر

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

معاشرے میں تعمیری تبدیلی کیسے لائی جائے؟

رجال کار کی تیاری کا ایک تعلیمی منصوبہ

ضرورت ہے کہ ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جس کا مقصد سوشل سائنسز میں ایسے سکالرز تیار کرنا ہو جو قرآن وسنت کی روشنی میں عصر حاضر کے مسائل کو سمجھیں اور ان کا حل پیش کرتے ہوئے دنیائے اسلام میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً اسلامی نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار کریں اور ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے کی کوشش کریں جو اتحاد اسلامی کا علمبردار، امن وآشتی کا گہوارہ اور ترقی وخوشحالی کا آئینہ دار ہو۔ اس ادارے کا نام "المرکز الاسلامی للتربیۃ و التعلیم" (Centre for Promotion of Islamic Research and Training) ہوسکتا ہے۔

حکمت عملی

حکمت عملی کا پہلا قدم ایسے رجالِ کار کی تیاری ہے جو جدید اور قدیم علوم کے ماہر، تحقیق واجتہاد کی صلاحیتوں کے حامل اور اخلاق وکردار کی نعمتوں سے مالا مال ہوں۔ ایسے رجالِ کار کی جب ایک قابل ذکر تعداد تیار ہو کر زندگی کے مختلف شعبوں میں برسرِ کار ہو جائے گی تو ان رجالِ کار کی نیٹ ورکنگ سے علم وعمل اور تحقیق وتربیت کا کام آگے بڑھایا جائے گا اور ایک ایسا سماجی ماحول پیدا کیا جائے گا جس کے اثر ورسوخ سے معاشرے کے سیاسی، معاشی اور انتظام وانصرام کے ڈھانچے میں مطلوبہ تبدیلیاں از خود آنی شروع ہو جائیں گی۔ اس کام کا مستقل ہدف تربیت اور تحقیق کا شعبہ رہے گا اور ہائر ایجوکیشن کے ادارے اس کا مرکز رہیں گے۔

طریقِ کار

۱۔ ملک بھر میں کم از کم دس ایسے مراکز منتخب اور قائم کیے جائیں گے جہاں سے رجالِ کار کی تیاری کے کام کا آغاز ہوگا۔ مرکزی ادارہ ان منتخب مراکز کی رہنمائی، معاونت اور نگرانی کرے گا۔

۲۔ ہر منتخب مرکز میں پندرہ ایسے ذہین فاضل نوجوان لیے جائیں گے جنہوں نے حال

ہی میں درس نظامی کی تکمیل کی ہوگی اور پندرہ ایسے ذہین بی ایس یا ماسٹر ڈگری ہولڈرز نوجوان لیے جائیں گے جنہوں نے عمرانی اور سائنسی علوم کی تعلیم حاصل کی ہوگی۔ایک سال تک درسِ نظامی گروپ کے فاضلین کو انگریزی، جنرل سائنس اور تہذیب مغرب کی تعلیم دی جائے گی خصوصاً انگریزی زبان میں ان کی صلاحیت اطمینان بخش حدتک پیدا کی جائے گی۔

جدید تعلیم کے حامل نوجوانوں کو عربی زبان کی تعلیم کے ساتھ قرآن وحدیث کا ایک خصوصی کورس کرایا جائے گا اور زیادہ زور عربی زبان میں اطمینان بخش صلاحیت پیدا کرنے پر ہوگا۔

دونوں گروپس کے نوجوانوں کو درج ذیل علماء وسکالرز کی منتخب کتابوں کا گہرا مطالعہ کرنے اور ایک مرتب نظام الاوقات کے تحت ان پر سٹڈی سرکل کرانے کا اہتمام کیا جائے گا:

سید قطب، محمد قطب، ڈاکٹر یوسف القرضاوی، ڈاکٹر اسماعیل راجی الفاروقی، ڈاکٹر سید محمد نقیب العطاس، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر محمد اقبال، ڈاکٹر رفیع الدین، مولانا اشرف علی تھانوی، سید ابواعلیٰ مودودی، ڈاکٹر ہوف مین مراد، ضیاء الدین سردار، محمد اسد، ڈاکٹر محمود احمد غازی، پروفیسر خورشید احمد، ڈاکٹر محمد امین، حافظ محمد موسیٰ بھٹو، سید خالد جامعی، حامد کمال الدین، ڈاکٹر زاہد صدیق مغل وغیرہ۔

٣۔ ایک سال کی علمی وفکری تیاری کے بعد ان ٣٠ نوجوانوں کو کسی نہ کسی شعبہ میں پی ایچ ڈی کرنے کی طرف راغب کیا جائے گا اور اس سلسلہ میں ان کی معاونت کی جائے گی۔ پی ایچ ڈی کے کورسز تو وہ وہی کریں گے جو یونیورسٹی کی طرف سے مقرر ہوں گے لیکن ریسرچ مقالے کے لیے موضوعات کی ایک فہرست تیار کی جائے گی اور اس فہرست سے ان سکالرز کو انتخاب کا کہا جائے گا۔ موضوعات ایسے ہوں گے جو اسلام کی روشنی میں عصر حاضر کے مسائل اور اشوز کو زیر بحث لائیں گے۔

٤۔ ان سکالرز کے پی ایچ ڈی میں داخلے کے بعد رابطے اور رہنمائی کے لیے ہر تین ماہ بعد ایک اجلاس ہوا کرے گا جس کا مقصد رابطہ، معاونت اور سکالرز کی مسلسل تربیت ہوگا۔

٥۔ جوں جوں سکالرز اپنا پی ایچ ڈی پروگرام مکمل کرتے جائیں گے ان سے مقالات کی نقول حاصل کر کے ان کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے گا۔ ان سے آرٹیکل لے کر اسلامی مسائل پر مجموعہ ہائے مضامین شائع کرائے جائیں گے اور اس طرح اسلامی تناظر میں علم کے

ذخیرے میں اضافے کی کوشش کی جائے گی۔

۶۔ جو سکالرز اپنی تعلیم مکمل کرلیں گے انہیں یونیورسٹیوں اور کالجوں میں برسرِ روزگار کرنے کا اہتمام کیا جائے گا اور ان سے درخواست کی جائے گی کہ جس طرح ان کی تعلیم وتربیت کا اہتمام ہوا اسی طرح وہ اپنی سطح پر یہ کام جاری رکھیں اور معلومات اپنی مادرِ علمی کو فراہم کرتے رہیں۔

۷۔ یہ سکالرز جب مختلف اداروں میں پھیل جائیں گے تو ان کے درمیان نیٹ ورکنگ کی جائے گی اور ان کی سہ ماہی میٹنگز کا اہتمام جاری رہے گا اور کام کو آگے بڑھانے کے لیے عمل میں تسلسل قائم رکھا جائے گا۔

نتائج

سکالرز کی ایک معقول تعداد تیار ہونے کے بعد اور ان کے درمیان باقاعدہ مقصدی نیٹ ورکنگ کی وجہ سے توقع ہے کہ ایک تو اسلامی نقطۂ نگاہ سے علم کا فروغ ہوگا اور دوسری طرف یہ علم معاشرے میں اپنا اصلاحی اثر (Impact) پیدا کرے گا اور آغاز میں جو اس منصوبے کا مقصد بیان کیا گیا تھا وہ مقصد پورا ہونا شروع ہوجائے گا۔ علم اور صاحبانِ علم کی اپنی قوت ہوتی ہے خصوصاً جب کوئی مقصد پیشِ نظر ہو اور ساتھ ہی رابطے کام کررہے ہوں۔ اوپر بیان کیے گئے طریقے سے تیار کیے گئے رجال کار یا تو اپنے طور پر ایک تنظیم میں ڈھل جائیں گے یا اپنے ہدف اور مقصد کے مطابق کام کرنے والی کسی تنظیم میں شامل ہوکر اس کی تقویت کا باعث بنیں گے۔

پراجیکٹ کی مالی ضروریات

۱۔ مرکزی ادارے کی فنانسنگ ضروری ہوگی تاکہ وہ متحرک رہے۔

۲۔ جن سکالرز کو تربیت، تعلیم اور تحقیق کے لیے منتخب کیا جائے گا اگر وہ خود کفیل نہ ہوں تو ان کی مناسب مالی ومعاونت ضروری ہوگی۔ پہلے سال پانچ ہزار فی سکالر فراہم ہوں تو کام چل سکتا ہے جبکہ پی ایچ ڈی کی تعلیم کے دوران یہ اعزازیہ بڑھانا پڑے گا تاکہ سکالرز کو مالی دشواری کا سامنا نہ ہو۔

۳۔ مالیات کی فراہمی کے لیے ایسے مخیر حضرات کو متحرک کرنا ہوگا جو پراجیکٹ کے مقاصد سے متفق ہوں اور اس کام کو امت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ کے لیے ضروری سمجھتے ہوں۔

ڈاکٹر محمد امین

خاتمہ تعلیمی ثنویت پروگرام

(Elimination of Dichotomy Program [EDP])

ڈپلومہ علوم عصریہ	ڈپلومہ علوم اسلامیہ
برائے: دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ و جونئر اساتذہ	برائے: یونیورسٹی گریجوایٹس و ایم فل طلبہ (کسی بھی مضمون کے)
مدت: ایک سال	مدت: ایک سال
وقت: مغرب تا عشاء (دو گھنٹے روزانہ) ۴۵ منٹ کے تین پریڈ	وقت: مغرب تا عشاء (دو گھنٹے روزانہ) ۴۵ منٹ کے تین پریڈ
ایام: پیر، منگل، بدھ	ایام: جمعرات، جمعہ، ہفتہ
دورانیہ: ۴ ماہ کے تین سمسٹرز	دورانیہ: ۴ ماہ کے تین سمسٹرز
نصاب	نصاب
پہلا سمسٹر ۱۔ انگریزی زبان ۲۔ تعارف عصری علوم ۳۔ مغربی فکر و تہذیب	**پہلا سمسٹر** ۱۔ ترجمۂ قرآن ۲۔ عربی زبان ۳۔ مطالعۂ حدیث
دوسرا سمسٹر ۱۔ انگریزی زبان ۲۔ مغربی فکر و تہذیب ۳۔ اسلام اور عصری مسائل	**دوسرا سمسٹر** ۱۔ ترجمۂ قرآن ۲۔ عربی زبان ۳۔ مغربی فکر و تہذیب
تیسرا سمسٹر ۱۔ انگریزی زبان ۲۔ مغربی فکر و تہذیب ۳۔ اسلام اور عصری مسائل	**تیسرا سمسٹر** ۱۔ ترجمۂ قرآن ۲۔ مغربی فکر و تہذیب ۳۔ اسلام اور عصری مسائل

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر شاہد صدیقی

اکیسویں صدی اور ہمارا فرسودہ امتحانی نظام

پاکستان میں نجانے کیوں نظامِ تعلیم میں بہتری کے سارے اقدامات نصابِ تعلیم میں تبدیلی کے خوشنما مسودے پر آ کر رُک جاتے ہیں۔ کچھ ماہرین تربیتِ اساتذہ کے پروگراموں کی افادیت پر زور دیتے ہیں۔ نصاب اور تربیتِ اساتذہ دونوں اہم ہیں لیکن ایک بنیادی جزو جو کسی بھی نظامِ تعلیم کو بگاڑنے اور سنوارنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے اور جسے اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے وہ ہمارا امتحانی نظام ہے جس کے تقاضے کمرۂ جماعت کی تدریس پر براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہر نئی حکومت نصابِ تعلیم کے حوالے سے تبدیلیوں کا اعلان کرتی ہے جو بدلتے ہوئے تعلیمی تقاضوں اور طلباء کی ضروریات کے حوالے سے ایک مثبت اقدام ہے لیکن بدقسمتی سے ہم اس مثبت اقدام کے ثمرات سے اس لیے محروم رہ جاتے ہیں کہ ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم ایک فرسودہ نظام ہے جو ماضی میں منجمد ہو چکا ہے۔ اس امتحانی نظام کی بنیادیں معروف ماہرِ نفسیات سکنر (Skinner) کے اس ماڈل پر استوار ہیں جس کے تحت تعلیم کا عمل بھی ایک عام عادت کی تشکیل کی طرح ہے جس میں تقلید (Immitation) اور تکرار (Repitition) دو بنیادی اجزاء ہیں۔ بعد میں آنے والے نفسیات دانوں نے تعلیم کے اس ماڈل سے اس بنیاد پر اختلاف کیا کہ تعلیم کا عمل اتنا سادہ نہیں کہ اسے تقلید اور تکرار تک محدود کر دیا جائے۔ اس کے برعکس یہ ایک انتہائی پیچیدہ عمل ہے جس کی منزل طالبِ علم کی ہمہ جہت نشوونما (Holistic Development) ہے۔ نظامِ تعلیم کے تجزیے میں یہ بات انتہائی اہم ہے کہ ہمارا علم کا تصور کیا ہے؟ کیا ہم علم کو جامد سمجھتے ہیں یا ایک حرکی تصور (Dynamic Concept)۔ پاکستان کے بیشتر سکولوں میں علم کو ایک جامد شے سمجھا جاتا ہے اور تعلیم کا مقصد صرف یہی لیا جاتا ہے کہ اس جامد شے کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کیا جائے۔ اس سارے نظام میں ایک طرف علم کو جامد چیز تصور کیا جاتا ہے اور دوسری طرف طلباء کو خالی برتن (Empty Vessels) سمجھا جاتا ہے۔ یوں استاد کا واحد مقصد جامد علم کو ان خالی برتنوں میں منتقل کرنا ہے۔

دنیا تعلیم کے اس فرسودہ تصور سے کہیں آگے نکل گئی ہے لیکن ہم ابھی تک تاریخ کے اسی گُم گشتہ لمحے میں رُکے ہوئے ہیں۔ ہمارے نظامِ امتحان کا بنیادی نکتہ یادداشت ہے جو طالبِ علم اس جامد علم کا رٹا لگا لے وہ امتحان میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں امتحان میں نمایاں کامیابی کے لیے مضمون کی سمجھ بوجھ کی بجائے اچھی یادداشت کا ہونا ضروری ہے۔ اس سارے نظام میں سمجھ بوجھ، غوروفکر اور تنقیدی سوچ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس فرسودہ نظامِ امتحان کے اثرات تعلیمی عمل میں شریک سب کرداروں پر مرتب ہوتے ہیں۔ امتحان کے دنوں میں بچوں سے زیادہ والدین اضطراب کا شکار ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ بچوں سے زیادہ یہ والدین کا امتحان ہے۔ سب کی ایک ہی خواہش ہوتی ہے: امتحان میں اچھے گریڈ کا حصول۔ اسی طرح طلباء امتحان میں اچھے گریڈ لینے کے لیے ہلکان ہوئے جاتے ہیں۔ وہ اصل ٹیکسٹ کو سمجھنے اور اس کے مفہوم پر غور کرنے کی بجائے ساری توجہ اسے یاد کرنے پر صرف کرتے ہیں۔

اس فرسودہ نظامِ تعلیم کا دباؤ اساتذہ پر بھی ہوتا ہے کیونکہ اچھا استاد اسے سمجھا جاتا ہے جس کی کلاس میں زیادہ A گریڈز آئیں۔ چونکہ امتحانی نظام رٹے کی بنیاد پر استوار ہے اس لیے اچھا نتیجہ حاصل کرنے کیلئے استاد بھی اس فرسودہ نظام کے تقاضوں کے مطابق طلباء کو امتحان کی تیاری اس طرح کراتا ہے کہ وہ امتحان میں سوالات کے جوابات فرفر لکھ سکیں۔ یوں کمرۂ جماعت میں غوروفکر اور تخلیقی وتنقیدی سوچ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

اساتذہ کے علاوہ سکول کے پرنسپل کی بھی اولین ترجیح سکول کا اچھا نتیجہ ہوتا ہے‘ لہٰذا ان کی پوری توجہ اور کوشش پراڈکٹ پر ہوتی ہے اور پراسیس کو یکسر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ منفی مقابلے (Negative Compitition) کی دھند میں انفرادی سوچ، تنقیدی طرزِ فکر، اور آزادیٔ اظہار کے خواب دم توڑ دیتے ہیں۔ سکول اپنے آپ کو بہترین سکول ثابت کرنے کے لیے کئی طرح کے داؤ پیچ استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر منتخب شدہ ابواب کی تدریس کروانا جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ نویں جماعت کا نصاب آٹھویں جماعت میں پڑھانا یعنی پڑھائی کے بوجھ کو بڑھا دینا اور دسویں کے طلبہ کو رگڑا دینا تاکہ بہتر گریڈ حاصل کر سکیں۔

ایک اور حربہ بورڈ کے امتحان سے پہلے کمزور طلبہ کو خارج کر دینے کا بھی اختیار کیا جاتا ہے۔ ایسے طلباء جن کے امتحان میں ناکام ہونے یا پھر کم نمبر لینے کا خدشہ ہو، انہیں سکول کے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اخلاقی یا قانونی لحاظ سے یہ عمل کیسا ہے؟ یہ ایک علیحدہ معاملہ ہے مگر سو فیصد نتائج اور زیادہ سے زیادہ اے گریڈ حاصل کرنے کی یہ کامیاب اور موثر تکنیک ہے۔

آیئے جائزہ لیتے ہیں کہ ہمارے امتحانی نظام میں زیادہ تر کس طرح کے سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ امتحانی پرچوں کا جائزہ لیں تو زیادہ تر سوالات کا تعلق معلومات کی فراہمی سے ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ امتحانی پرچوں میں زیادہ تر سوالات What کی کیٹگری میں آتے ہیں۔ Why اور How کے سوالات ہمارے امتحانی پرچوں میں خال خال ہی نظر آئیں گے۔ اس لحاظ سے ہمارے طالب علم، علم کے پہلے درجے یعنی معلومات کو یاد رکھنے تک محدود رہتے ہیں۔

امتحانی نظام میں کامیاب ہونے کے لیے طلباء کو تنقیدی سوچ (Critical Thinking) کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑتی اس لیے کہ ہمارا نظامِ امتحان جو ہمارے تعلیمی نظام کا اہم جزو ہے طلباء کو اندھی تقلید (Conformity) کا عادی بنا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلباء جب تعلیم مکمل کرنے کے بعد عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو معاشرے میں کولہو کے بیل کی طرح شریک ہو جاتے ہیں جن کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی ہے اور وہ ساری عمر زندگی کے رہٹ پر ایک ہی ڈھب میں گزار دیتے ہیں۔ انہیں معاشرے میں اردگرد پھیلی ناانصافیاں نظر نہیں آتیں کیونکہ ان کی آنکھوں پر اندھی تقلید کی پٹی بندھی ہوتی ہے۔ نہ ہی وہ کسی ناانصافی پر سوال اُٹھاتے ہیں کیونکہ ان میں سوال پوچھنے کی صلاحیت کو سکول کے ابتدائی دنوں میں ہی ختم کر دیا جاتا ہے۔ یوں تعلیم جو کسی بھی معاشرے میں تبدیلی لانے کا مؤثر ہتھیار سمجھی جاتی ہے وہ ایک بے اثر شے بن کر رہ جاتی ہے۔ اگر ہمیں اپنے نظامِ تعلیم میں تبدیلی لانی ہے تو اپنے فرسودہ نظامِ تعلیم میں بنیادی تبدیلیاں لانا ہوں گی۔ امتحانی پرچوں میں سوالات کی تیاری اور اور تعلیمِ اساتذہ میں Assessment کے حوالے سے ٹریننگ اہم امتحانی نظام میں جوہری تبدیلی کے لیے تعلیمی بورڈز اور تربیتِ اساتذہ کے پیشہ ورانہ اداروں میں اشتراکِ عمل ضروری ہے۔ اس

کے لیے تعلیمی سیمینارز، کانفرنسیں اور ورکشاپس اہم کردار ادا کرسکتی ہیں۔ نظامِ امتحان میں ہنگامی بنیاد پر بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہے کیونکہ ہم پہلے ہی تعلیمی میدان میں جنوبی ایشیا کے ممالک سے پیچھے رہ چکے ہیں۔ اکیسویں صدی سخت مقابلے اور مسابقت کی صدی ہے، جہاں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کے لیے جن مہارتوں کی ضرورت ہے ان میں تنقیدی سوچ (Critical Thinking) اور تخلیقی صلاحیت (Creativity) سرِفہرست ہیں۔ آج کا اہم سوال یہ ہے کہ کیا ہمارا نظامِ تعلیم اکیسویں صدی کے چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہے؟ ایک ایسا نظامِ تعلیم جس کا فرسودہ نظامِ امتحان تاحال سوچ کی زیریں سطح (Lower Order Thinking) کے گرد گھوم رہا ہے۔

نعت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمالِ بے نقاب

شوق تیرا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب، میرا سجود بھی حجاب

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب

(اقبالؒ)

تعلیم و تربیت / ملی مجلس شرعی ادارہ

دینی مدارس کے وفاقوں کے قائدین کی خدمت میں

دینی مدارس کے موجودہ حالات میں جرأت مندانہ اقدامات کی ضرورت ہے

ملی مجلس شرعی جو سارے دینی مکاتب فکر کا مشترکہ فورم ہے، اس کے علماء کرام خصوصاً صدر مجلس مولانا زاہدالراشدی، جنرل سیکرٹری ڈاکٹر محمد امین، مولانا ڈاکٹر راغب نعیمی، مولانا حافظ عبدالغفار روپڑی، مولانا عبدالرؤف فاروقی، ڈاکٹر فرید احمد پراچہ، علامہ محمد خلیل الرحمن قادری، مولانا قاری جمیل الرحمٰن اختر، مولانا حافظ ڈاکٹر حسن مدنی و دیگر نے مندرجہ ذیل عرضداشت قائدین اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ کی خدمت میں پیش کی ہے:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

آپ حضرات والا سے درخواست ہے کہ مندرجہ ذیل حقائق پر غور فرمائیں:

۱۔ حکومت نے حال ہی میں ''اسلام آباد وقف بل'' پاس کیا ہے جس میں اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ سے مشورہ نہیں کیا گیا۔ اس بل میں مدارس و مساجد کو دہشت گردی میں ملوث سمجھتے ہوئے ان کے آزادانہ کام کرنے اور ان کی تمویل پر پابندیاں لگادی گئی ہیں جن سے وہ تقریباً حکومتی کنٹرول میں چلے جائیں گے اور ان کی آزادانہ حیثیت ختم ہوجائے گی۔ حکومت اگر دینی مدارس کو تعلیمی ادارے سمجھتی تو یہ سب نہ ہوتا کیونکہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کو ان جکڑ بندیوں میں شامل نہیں کیا گیا۔

یہاں دو باتیں ذہن میں رکھنی چاہئیں۔ انگریز نے مدارس ختم نہیں کیے تھے، ان کے اوقاف ختم کردیے تھے، مدارس بتدریج خود بخود ختم ہوگئے۔ پاکستان میں جتنے بھی مدارس اور اوقاف حکومتی قبضے میں گئے وہ بتدریج غیر فعال اور غیر مؤثر ہوگئے اور محض کاغذوں میں باقی ہیں لہٰذا آج بھی اوقاف پر حکومتی کنٹرول کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ مدارس بتدریج غیر فعال ہوکر ختم ہوجائیں گے۔

۲۔ حکومت مدارس کی شہادات قبول نہیں کرتی۔ ایچ ای سی عالمیہ کی شہادۃ قبول کرتی ہےلیکن وہ بھی صرف تعلیمی معاملات ے لیے۔

۲.۱۔ اب حکومت نے اتحاد تنظیمات مدارس سے منوالیا ہے کہ وہ لازماً میٹرک، ایف اے کا امتحان کسی حکومتی بورڈ سے دلوائیں گےجس سے مدارس کے ثانویہ عامہ، ثانویہ خاصہ کی حیثیت ختم ہوجائے گی اورحکومت کا سیکولر نصاب پڑھانا پڑے گا۔

۲.۲۔ حکومت نے حال ہی میں 'یکساں قومی نصاب' منظور کیا ہےلیکن اس کی تیاری میں مدارس کے نمائندوں کو شامل نہیں کیا گیا۔ صرف اسلامیات میں انہیں شامل کیا گیا لیکن وہاں بھی قرآن حکیم کی تدریس کے لیے الگ پریڈ نہیں دیا گیا لہٰذا اس کا شامل ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ باقی سارا نصاب ہیومنزم اور سیکولرزم پر مبنی ہے۔ حکومت آج بھی کوشش کررہی ہے کہ وہ انگلش میڈیم ہو اور پرائمری کے بعد ثانویہ عامہ وخاصہ (یا میٹرک، ایف اے) میں تو وہ لازماً اسے انگلش میڈیم رکھے گی۔ یاد رہے کہ وزیر تعلیم نے بڑے انگلش میڈیم سکولوں کے غیر ملکی امتحانات (او اے لیول) کو اس ''یکساں قومی نصاب'' سے مستثنیٰ قرار دیا ہے اور یہ حکومتی سکولوں اور دینی مدارس پر نافذ ہوگا کیونکہ اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ نے حکومت سے جو معاہدہ کیا ہے اس میں یہ شامل ہے۔

۳۔ خلاصہ یہ کہ حکومت مدارس ومساجد کو دہشت گردی سے جوڑ کر انہیں قومیانا چاہ رہی ہے تا کہ ان کی آزادانہ حیثیت ختم ہو جائے اور جدید سیکولر نصاب اور نظام امتحان ان پر مسلط کررہی ہے تا کہ وہ غیر مؤثر ہوجائیں۔ جس طرح اسلام آباد وقف بل خاموشی سے منظور ہو گیا اور دینی قوتوں کا پتا ہی نہیں چلا۔ ایسے ہی کسی وقت سارے ملک کے لیے اوقاف بل منظور ہوجائے گا اور دینی لوگوں کو بعد میں پتا چلے گا۔

پس چہ باید کرد

ان حالات میں دینی مدارس اور اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ کو کیا کرنا چاہیے؟ ہماری تجاویز درج ذیل ہیں:

i۔ ۳۵ ہزار دینی مدارس، ان کے ہزاروں اساتذہ اور لاکھوں طلبہ ایک بڑی قوت

ہیں۔سوال یہ ہے کہ دینی مدارس خاموشی سے مظلومانہ ذبح کیوں ہوں؟ آئین وقانون کے اندر رہتے ہوئے پرامن مزاحمت کیوں نہ کی جائے؟ اور اپنا وجود مٹنے سے کیوں نہ بچایا جائے؟

ii۔ مغرب زدہ جدید نظام تعلیم کو خود پر مسلط ہونے سے بچایا جائے۔اس کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ دینی مدارس اور اتحاد تنظیمات مدارس دینیہجد ید نظام تعلیم کو اپنے کنٹرول میں لائے۔اس کے لیے یہ بھی ناگزیر ہے کہ اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ کی ممبر تنظیمیں دل کھلا کریں اور اپنے اپنے ''مسلک'' پر زور دینے کی بجائے ''دین'' کے مشترکات پر مبنی ایک نصاب پر متفق ہو جائیں (نصاب پر اتفاق آسان ہے۔نصابی کتابیں اپنی اپنی رکھی جاسکتی ہیں) اور مل کر اپنا ایک ''بورڈ'' اور ایک ''یونیورسٹی'' حکومت سے منظور کرا لیں اور سارے مدارس اس بورڈ اور یونیورسٹی سے الحاق کر لیں۔اسی طرح پہلی سے آٹھویں جماعت تک تعلیم کا انتظام بھی مدارس خود کریں۔اگر وہ یہ نہیں کریں گے تو پھر حکومت مغرب زدہ جدید نظام تعلیم ان پر مسلط کر کے رہے گی اور دینی تعلیم بتدریج ان کے ہاتھ سے نکلتی چلی جائے گی۔اس وقت آٹھویں جماعت تک تعلیم کا اکثر مدارس خود اہتمام نہیں کرتے۔مدارس کے طلبہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے بھی یونیورسٹی میں جاتے ہیں۔اگر ثانویہ عامہ اور خاصہ بھی حکومت کے پاس چلا گیا تو پھر مدارس کے پاس کیا رہ جائے گا؟

iii۔ ان حالات کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ کی قیادت مضبوط اور جرأت مندانہ مؤقف اختیار کرے۔جو لوگ حکمرانوں کے مقابلے میں مضبوط مؤقف اختیار نہیں کر سکتے، دیانت کا تقاضا ہے کہ وہ موزوں افراد کے لیے جگہ خالی کر دیں۔

iv۔ اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ مندرجہ ذیل چارٹر آف ڈیمانڈ حکومت کو پیش کرے:

۱۔ حکومت اسلام آباد وقف بل واپس لے اور اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ کے ساتھ مشاورت کر کے اسے تبدیل کرے۔

۲۔ مدارس یکساں قومی نصاب قبول نہیں کریں گے جب تک سارے نصاب میں دینی مدارس سے مشاورت نہ کی جائے اور نصاب ہیومنزم اور سیکولرزم کی بجائے اسلام اور دو قومی نظریے پر مبنی نہ ہو۔نیز انگلش میڈیم، غیر ملکی امتحانات اور مخلوط تعلیم کا خاتمہ بھی ضروری ہے۔(بقیہ صفحہ نمبر:۵۱)

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد امین

عصر حاضر میں 'ریاستِ مدینہ' کا احیاء کیسے ممکن ہے؟

مغرب کے سیاسی و جمہوری نظام سے مستفاد پاکستان کے موجودہ ریاستی ڈھانچے کے ذریعے ریاست مدینہ کا احیاء ممکن نہیں۔ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ ریاست مدینہ کے قیام کے لیے وہی طریقہ اختیار کیا جائے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اختیار کیا تھا یعنی اسلامی تعلیمات کے مطابق فرد کی تبدیلی، معاشرے کی اصلاح اور پھر ان کے ذریعے اسلامی تعلیمات کے مطابق ریاست مدینہ کا قیام۔

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ عمران خان اور ان کی تحریکِ انصاف ریاست مدینہ کا جو نعرہ لگا رہی ہے وہ محض ایک سیاسی سٹنٹ ہے اور وہ اس میں سنجیدہ نہیں ہے۔ ہمیں ان سے اتفاق ہے لیکن ہم کہتے ہیں کہ اگر وہ سنجیدہ ہو بھی تو عمران خان، ان کی پارٹی کے لوگ بلکہ عام پڑھے لکھے لوگوں، پروفیشنلز اور علماء کرام میں سے بھی کتنے ہیں جنہوں نے کبھی اس پر غور کیا ہو یا اس کا مطالعہ کیا ہو کہ ریاست مدنیہ کیسی ریاست تھی اور کس طرح وجود میں آئی تھی؟ اور آج اسے کیسے وجود میں لایا جا سکتا ہے؟

'ریاست' کا جو لفظ ہم اُردو میں استعمال کرتے ہیں اور اس سے جو معنی مراد لیتے ہیں، وہ مغرب کا تصورِ ریاست ہے۔ کیا اسلام میں بھی ریاست کا یہی تصور ہے؟ اور اگر یہ نہیں ہے تو پھر اس ضمن میں اسلام کا تصور کیا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو سیاسی نظام مدینہ میں رائج کیا تھا، وہ کیا تھا اور کیا اسے آج عصر حاضر میں Replicate کیا جا سکتا ہے؟ اگر کیا جا سکتا ہے تو کس طرح؟ اس کے لیے آج کے ریاستی ڈھانچے اور گورننس میں کیا تبدیلیاں لانا ہوں گی اور کیسے؟ یہ ایک ضخیم کتاب کا موضوع ہے اور دس پندرہ صفحات میں اس سے انصاف نہیں کیا جا سکتا لیکن ہمارے پیش نظر چونکہ اس وقت اس موضوع پر ایک مختصر مقالہ لکھنا ہے اس لیے ہم کوشش کریں گے کہ مختصر انداز میں اپنی گزارشات قارئین کے سامنے رکھ دیں۔ اللہ کرے یہ اختصار مخل فہم نہ ہو۔

ہمارے اس مقالے کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں بتائیں گے کہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ کی ریاست کیسے قائم کی اور وہ کس طرح کی ریاست تھی؟ اور دوسرے حصے میں بتائیں گے کہ پاکستان کا موجودہ ریاستی ڈھانچہ جو مغرب کے سیکولر، لبرل اور سرمایہ دارانہ سیاسی جمہوری نظام سے استفادے پر مبنی ہے، اس کے ذریعے ریاست مدینہ قائم نہیں کی جاسکتی بلکہ ریاست مدینہ صرف اسی طریقے سے قائم کی جاسکتی ہے جس طرح نبی کریم ﷺ نے قائم کی تھی یعنی پہلے انہوں نے فرد اور معاشرے کی اصلاح کی اور انہیں اسلامی تعلیمات کے مطابق بدلا، پھر ان کے ذریعے اسلامی تعلیمات کے مطابق ریاست مدینہ قائم کی۔ لہٰذا ہم اگر پاکستان کو ریاست مدینہ جیسا بنانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ فرد اور معاشرے کو اسلامی حوالے سے بدلا جائے اور موجودہ ریاستی ڈھانچے کی اسلامی تناظر میں مکمل طور پر تشکیل نو کی جائے۔

لیکن ان دونوں باتوں سے پہلے ہمیں اصطلاحات کی پیچیدگی سے نمٹنا ہوگا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں جو چیز قائم کی تھی، آپ نے اسے کبھی 'ریاست' یعنی State نہیں کہا۔ ماضی کے اسلامی لٹریچر میں بھی ریاست یا سٹیٹ کا لفظ ہمیں نظر نہیں آتا۔

اصطلاحات کا مسئلہ

لفظ کا چناؤ اور خصوصاً اصطلاحات کا استعمال انتہائی اہم معاملہ ہے جس کی طرف عام لوگ زیادہ توجہ نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی زبان میں جب ہم کسی مفہوم کے لیے کوئی لفظ استعمال کرتے ہیں تو یہ محض سادہ عمل نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچھے پوری فکر اور تہذیب کھڑی ہوتی ہے۔ اس لفظ کا ترجمہ جب ہم کسی دوسری زبان میں کرتے ہیں تو اب دوسری زبان کے لفظ کسی دوسرے فکری پیراڈائم یا تہذیب کی پیداوار ہوتے ہیں لہٰذا ممکن ہے دوسری زبان کے الفاظ میں وہ مفہوم سمویا ہی نہ جاسکے جو پہلی زبان میں موجود تھا۔ مثلاً عربی اور اُردو میں ہم ذات باری کے لیے لفظ 'اللہ' استعمال کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی اس کا ترجمہ God کردے تو لفظ God میں وہ سارے مفاہیم موجود نہیں ہیں جو لفظ اللہ میں ہیں۔ اس لیے لفظ اللہ کا ترجمہ God کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

اصطلاحات کا معاملہ تو اور زیادہ گھمبیر ہو جاتا ہے کیونکہ اصطلاح کسی ایک لفظ یا کسی ایک مفہوم کے لیے استعمال نہیں ہوتی بلکہ بسااوقات پورے تصور (Concept) اور کئی مفاہیم کی حامل ہوتی ہے مثلاً ہمارے ہاں صلاۃ (نماز) کا ایک خاص مفہوم اور طریقہ ہے۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کوئی کہے کہ اس کا ترجمہ Prayer ہے تو یہ انگریزی لفظ 'صلاۃ' کی اصطلاح کے پورے مفاہیم ادا نہیں کرتا اور نہ کسی مسیحی کے ہفتے میں ایک دن چرچ جا کر مخلوط اجتماع میں موسیقی کے ساتھ گانے گا کر دعا مانگنے کو 'صلوۃ' کہا جاسکتا ہے۔ اسی لیے اہل علم کہتے ہیں کہ ایک زبان کی اصطلاح کا دوسری زبان میں ترجمہ نہیں کیا جاسکتا اور اگر کوئی کرے گا تو یہ غلط ہوگا اور خلط مبحث غموض، بحث وتنقید اور جدل ومناقشہ کا سبب بنے گا۔

ہم نے یہ مثالیں اس لیے دی ہیں کہ ان کا زیر بحث موضوع سے گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ 'ریاست مدینہ' ایک Phrase یا اصطلاح ہے جو ہم اردو میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ اصطلاح اس شکل میں نہ عربی میں مستعمل ہے اور نہ انگریزی میں۔ ریاست اردو ترجمہ ہے انگریزی لفظ State کا۔ اب انگریزی میں سٹیٹ کے لفظ کے ساتھ جو مفاہیم وابستہ ہیں، لفظ سٹیٹ کو ان مفاہیم ومعانی سے الگ کر کے اس کا اردو یا کسی اور زبان میں ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ انگریزی میں سٹیٹ کا مطلب ہے Nation State یعنی ریاست قومی ہوتی ہے۔ اب 'قوم' کا انگریزی میں اور مغربی فکر وتہذیب میں ایک خاص مفہوم ہے اور اس تہذیب میں قوم زبان، علاقے، نسل، رنگ اور علاقے کے اشتراک سے بنتی ہے۔ اسی طرح ریاست مغرب میں سیکولر ہوتی ہے یعنی ریاست کے چلنے میں کسی خدا، رسول، آخرت اور دین (انگریزی میں Religion) کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ مذہب لوگوں کا پرائیویٹ معاملہ ہوتا ہے اور ریاست ہمیشہ سیکولر ہوتی ہے یعنی مذہب کی مداخلت اور ہدایت کے بغیر لوگ اپنی عقل، سمجھ، تجربے سے ریاست چلاتے ہیں۔ اسی طرح مغرب میں ریاست لبرل ہوتی ہے یعنی عوام آزاد ہوتے ہیں کہ ریاست کو جو شکل دینا چاہیں، دے لیں، کوئی دین مذہب ان کا ہاتھ پکڑنے والا اور ان پر پابندی لگانے والا نہیں ہوتا۔ اسی طرح ریاست مغرب میں جمہوریت پر مبنی ہوتی ہے اور جمہوریت سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ مغرب میں ریاست ایک اصطلاح ہے

جیسے نیشنلزم، سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم اور ڈیموکریسی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

اسی طرح 'ریاست' کا لفظ اردو میں جس مفہوم میں استعمال ہوتا ہے، اس مفہوم میں یہ لفظ عربی میں بھی استعمال نہیں ہوتا۔ عربی میں لفظ رئاسہ ہے جو ہمارے 'ڈائریکٹوریٹ' کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے جیسے وہ ادارہ جو حرمین میں انتظامی امور دیکھتا ہے اس کا نام 'رئاسه خدمات الحرمين الشريفين' اور اس ادارے کے رئیس سابق خطیب حرم مکی شیخ عبداللہ السبیل ہیں اور یہ ادارہ مسجد نبوی کے بالکل قریب واقع ہے۔ رئاسہ کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے اردو میں قریب ترین لفظ رئیس ہے۔ جو اردو میں امیر، سردار، سربراہ، صدر کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے رئیس الجامعہ، رئیس المؤتمر یا رئیس مملکت وغیرہ۔

State کے معنوں میں عربی میں آج کل لفظ الدولہ استعمال ہوتا ہے لیکن قدیم عربی میں اور اسلامی لٹریچر میں لفظ الدولہ ہمیں کہیں نظر آتا ہے اور نہ الرئاسہ کا لفظ ملتا ہے۔ تو خلاصہ یہ کہ ہماری رائے میں 'ریاست مدینہ' کی اصطلاح ہی غلط ہے اور یہ مغربی مفاہیم کو اسلام پر تھوپنے کے مترادف ہے۔ اور یہ بات بالبداہت کہی جاسکتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں کوئی سٹیٹ یا ریاست قائم نہیں کی تھی۔

سطور بالا کی مختصر بحث سے واضح ہے کہ مغرب کا تصور ریاست وسٹیٹ اسلام میں موجود ہی نہیں اور نہ اہل اسلام نے کبھی ماضی میں ریاست یا State کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہمارا یہ موقف موجودہ ماحول میں اتنا اجنبی ہے کہ ہمیں عام لوگوں کے لیے اسے قابل فہم اور قابل ہضم بنانے کے لیے اس نکتے کی مزید وضاحت کرنا ہوگی۔

مغرب کا 'تصور ریاست' اسلام میں موجود ہی نہیں

کوئی بھی شخص جس کا فکر و دانش سے تعلق ہو یا اس نے مختلف علوم اور تہذیبوں کا مطالعہ کیا ہو وہ جانتا ہے کہ تصورات اور ادارے ہمیشہ کسی نظریے کی پیداوار ہوتے ہیں۔ یہ بالفعل ممکن نہیں کہ کوئی تصور، فعل یا ادارہ وجود رکھتا ہو لیکن اس کی پشت پر کوئی نظریہ نہ ہو۔ بعض سادہ بلکہ سادہ لوح لوگ جو یہ رائے رکھتے ہیں کہ ریاست ریاست ہوتی ہے خواہ وہ مغربی ہو یا اسلامی اور جمہوریت جمہوریت ہوتی ہے خواہ وہ مغربی ہو یا اسلامی۔ یہ رائے ایسی ہی ہے جیسے بلوچستان کے ایک وزیر اعلیٰ صاحب نے ازراہ تمسخر کہا تھا کہ ڈگری ڈگری ہوتی ہے خواہ وہ جعلی

ہو یا اصلی۔ صحیح بات جو سب جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ ڈگری وہی ہوتی ہے جو اصلی ہو اور جو جعلی ہو وہ ڈگری نہیں ہوتی کاغذ کا ایک ٹکڑا ہوتی ہے۔ جس طرح علوم الحدیث میں وضعی حدیث، حدیث نہیں ہوتی اور اگر کوئی شخص 'وضعی حدیث' کے لفظ سے یہ سمجھے کہ یہ حدیث ہی کی ایک قسم ہے تو اس جہالت پر سر پیٹنے کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے؟

اسی طرح ریاست (جو مغربی اصطلاح State کا اردو ترجمہ ہے) مغرب کی ایک اصطلاح ہے اور اس اصطلاح کا صحیح مفہوم مغرب کے فکری پیراڈائم یا بنیادی نظریات (Ideology) ہی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ مغرب کے بنیادی نظریات ہیں ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم اور ایمپر یسزم وغیرہ۔ یہاں ہمارے لیے ممکن نہیں کہ ان نظریات کی تفصیل میں جائیں لیکن اگر ان نظریات کا خلاصہ ہم ایک ایک جملے میں بیان کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ ہیومنزم کا مطلب ہے کہ انسان کا کوئی خدا نہیں، وہ خود خدا ہے اور مختار مطلق ہے۔ سیکولرزم کا مطلب ہے کہ مذہب ایک پرائیویٹ معاملہ ہے جو شخص خدا اور آخرت کو ماننا چاہتا ہے وہ اپنی ذاتی زندگی میں مان لے لیکن اجتماعی زندگی یعنی معاشرے اور ریاست کا کوئی تعلق مذہب اور خدا سے نہیں ہوگا۔ لبرل ازم کا مطلب ہے کہ انسان آزاد ہے جو چاہے سوچے اور جو چاہے کرے وہ کسی خدا اور رسول کا پابند نہیں ہے۔ کیپٹل ازم کا مطلب ہے مادہ پرستی اور دنیا پرستی جس میں نہ آخرت کا تصور ہو اور نہ کسی مذہب اور اخلاق کی ترجیح۔ ایمپر یسزم کا مطلب ہے کہ علم کا منبع انسانی عقل اور اس کے حسی تجربات ہیں نہ کہ آسمان سے نازل ہونے والی وحی۔ ان نظریات کا خلاصہ ہے دین یعنی توحید، رسالت، آخرت اور وحی کی نفی۔ ان نظریات پر مبنی ورلڈ ویو مذہبی نظریات کو توہمات اور ڈاگما (Dogma) سمجھتا ہے اور انہیں صحیح اور حتمی علم کی تعریف ہی سے خارج قرار دیتا ہے۔ ان نظریات یا آئیڈیالوجی سے مغرب کا جو سیاسی نظام ابھرتا ہے وہ نیشنلزم اور ڈیموکریسی کا علمبردار ہے اور مغرب میں ریاست کا تصور ایک قومی ریاست کا ہے یعنی Nation State کا جو ہیومنزم کی رو سے خدا کی طرح خود مختار ہوتی ہے، سیکولرزم کی رو سے اس میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ یہ لبرل ہوتی ہے بایں معنی کہ وہ مادر پدر آزاد ہوتی ہے جو چاہے کرے۔ کیپٹل ازم کے حوالے سے اس کے پیش نظر صرف لوگوں کی دنیوی اور مادی فلاح ہوتی ہے اور ایمپر یسزم کے حوالے سے یہ کسی وحی اور آسمانی ہدایت کو نہیں مانتی۔

ان اصولوں پر مغرب میں جو ریاست بنتی ہے اس کے بارے میں تفصیلی بحث کی یہاں گنجائش نہیں البتہ اس کے جو نتیجے نکلے ہیں ان میں سے دو کی طرف اشارہ کر کے ہم آگے بڑھیں گے۔ ایک یہ کہ اس کے نتیجے میں پہلی اور دوسری جنگ عظیم ہوئی جن میں اتنا جانی اور مالی نقصان ہوا کہ انسانی دنیا کی تاریخ میں جتنی جنگیں ہوئی ہیں ان سب کے نقصانات کو اگر جمع کیا جائے تو ان دو عظیم جنگوں کا نقصان ان سب سے زیادہ ہے۔ ان میں کروڑوں لوگ مارے گئے، لاکھوں گھر جلائے گئے، عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہوئے اور بیسوں ملک تباہ ہوئے۔ اس ریاست کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے جوئے، شراب نوشی، فحاشی، زنا، ہم جنسیت کو جائز اور حلال قرار دیا۔

ظاہر ہے ریاست کا یہ مغربی تصور سراسر غیر اسلامی ہے اور ایک معمولی پڑھا لکھا مسلمان بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ غیر اسلامی ہے۔ اور یہ بھی واضح رہے کہ ریاست کے اس غیر اسلامی تصور کے شروع میں 'اسلامی' لگانے سے ریاست 'اسلامی ریاست' نہیں بن جاتی اور نہیں بن سکتی جس طرح جوئے کے شروع میں اسلامی لگانے سے ''اسلامی جوا خانہ'' نہیں بن سکتا اور جس طرح شراب خانے کے شروع میں اسلامی لگانے سے 'اسلامی شراب خانہ' نہیں بن سکتا۔ اسی طرح مغرب کی سیکولر، لبرل اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کے شروع میں لفظ اسلامی لگا دینے سے وہ 'اسلامی جمہوریت' نہیں بن سکتی اور نہیں بن جاتی۔ اور نہ ریاست کے شروع میں لفظ اسلامی لگانے سے 'اسلامی ریاست' وجود میں آجاتی ہے اور نہ اسے مدینہ کی ریاست کہا جا سکتا ہے۔

اس سے یہ اصول واضح ہو گیا کہ ایک فکری اور تہذیبی پیراڈائم کے نظریات، تصورات اور اداروں کو دوسرے فکری اور تہذیبی پیراڈائم میں نہیں لے جایا جا سکتا اور نہ ان کا نتیجہ دوسرے پیراڈائم میں وہ نکل سکتا ہے جو پہلے پیراڈائم میں نکلا تھا۔ لہٰذا ایک فکری و تہذیبی پیراڈائم کی اصطلاحات کو دوسرے فکری اور تہذیبی پیراڈائم میں لے جا کر استعمال کرنا انتہائی کور فہمی ہے اور واضح طور پر غلط ہے۔ لہٰذا 'ریاست' کے مغربی تصور کے شروع میں اسلامی لگا دینے سے 'اسلامی ریاست' یا مدینہ کی ریاست وجود میں نہیں آتی اور نہیں آسکتی۔ اس کے نتیجے میں ریاست کا مغربی تصور ہی عملاً غالب آئے گا اور اس کا غالب آنا منطقی طور پر درست ہوگا اور ایسا ہی ہونا چاہیے لہٰذا مغرب کی ریاست کو مدینہ کی ریاست نہیں بنایا جا سکتا بلکہ وہ مغرب کی

جمہوری، سیکولر، لبرل اور سرمایہ دارانہ جمہوریت ہی بنے گی خواہ اس کا نام ہم غلط فہمی یا خوش فہمی سے 'اسلامی ریاست' یا 'مدینہ کی ریاست' ہی کیوں نہ رکھ لیں۔

خلاصہ یہ کہ 'ریاست' کا لفظ اور اصطلاح خالصتاً مغرب کے مخصوص ملحدانہ سیاسی نظام کا مظہر اور نمونہ ہے اور اس کے ساتھ اسلامی کا سابقہ لگا کر اسے 'اسلامی ریاست' یا 'مدینہ کی ریاست' نہیں سمجھا جاسکتا اور نہیں بنایا جاسکتا۔ یہاں یہ بات بھی قارئین پر واضح ہوگئی ہوگی کہ ہر فکری پیراڈئم اپنے نظریات کی مناسبت سے الفاظ واصطلاحات وضع کرتا ہے جن کے مخصوص معانی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے قارئین کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہونا فطری ہے کہ اسلام اگر ریاست کی اصطلاح استعمال نہیں کرتا تو اس مفہوم میں وہ کیا اصطلاح استعمال کرتا ہے؟

اسلام میں 'ریاست' کی بجائے متبادل اصطلاحات

اسلام کا بنیادی نظریاتی ڈھانچہ یہ ہے کہ وہ توحید، رسالت اور آخرت کا تصور دیتا ہے اور اس کے ورلڈ ویو میں بنیادی حیثیت تصور الٰہ کو حاصل ہے جو اختصار کے ساتھ یہ ہے کہ انسان کا اور اس کائنات کا خالق، مالک، ربّ، ہادی، معبود، مطاع، زندگی وموت اور نفع ونقصان پر قادر ایک اللہ ہے جس کا کوئی ہمسر نہیں اور کوئی اس جیسا نہیں۔[۱] انسان اللہ کی حقیر مخلوق ہے جسے اپنے مالک کی عبادت یعنی بندگی واطاعت بجالانا ہے۔[۲] دنیا چند روزہ اور انسان کے لیے دار الامتحان ہے[۳] اور اصل زندگی آخرت کی ہے جہاں دنیا میں کیے گئے اعمال کا نتیجہ نکلے گا اور انہی کے مطابق وہ اللہ سے جزا اور سزا پائے گا۔[۴]

انسان کے عبد ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلیفہ بھی کہا ہے۔[۵] اس خلافت کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو اللہ کو مانے اور

---

[۱] الاخلاص ۱۱۲:۴

[۲] الذاریات ۵۱:۵۶

[۳] الملک ۶۷:۲

[۴] البینہ ۹۸:۶تا۸

[۵] البقرہ ۲:۳۰

چاہے تو نہ مانے۔ دوسرے یہ کہ اسے کائنات میں تصرف کا اختیار دیا ہے کہ وہ اسے اپنے استعمال میں لائے۔لیکن انسان کے عبد ہونے کی بنیادی حیثیت کا تقاضا یہ ہے کہ ان دونوں کاموں میں وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی پیش نظر رکھے اور اس کی عبادت واطاعت کا رویہ اختیار کرے نہ کہ اپنی مرضی کرے یا ابلیس کی اتباع کرے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو بھی خلیفہ کہا ہے [۱] بایں معنی کہ وہ حکمران اور صاحب اقتدار تھے لیکن اس اقتدار اور قوت کو وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق استعمال کرتے تھے نہ کہ اپنی مرضی اور خواہش نفس سے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو اللہ تعالیٰ کے رسول تھے۔ اور دین ودنیا کی سارے حیثیتوں کے جامع تھے لیکن آپ کے بعد لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ کہنا شروع کردیا یعنی خلیفہ الرسول چونکہ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اقتدار میں آئے تھے۔ چونکہ عربی زبان کی رو سے اس لفظ کو آنے والے مزید اصحاب اقتدار کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا لہٰذا حضرت عمرؓ نے صحابہ کرام کے مشورے سے خود کو ''امیر المومنین'' کہلوانا شروع کردیا۔ بعد میں 'خلافت' کا لفظ مسلمانوں کے سیاسی نظام کے لیے مختص اور پختہ ہوگیا، ان دونوں معنوں میں کہ مسلمان حکمران اپنی من مانی نہیں کرسکتے بلکہ شریعت مطہرہ کے پابند ہوتے ہیں اور ایک لحاظ سے نائب رسول بھی ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ مسلمانوں نے 'خلافت' اور 'امارت' کی اصطلاح استعمال کی نہ کہ 'ریاست' کی۔ بلکہ انہوں نے تو 'حکومت' کی اصطلاح کو بھی ناپسند کیا کیونکہ حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ تاہم مسلمان حکمران یا تو خلیفہ کہلواتے تھے یا امیر المومنین اور حکمرانوں اور قاضیوں کو حاکم کہا جاتا تھا اور آخری عہد میں بعض لوگ اپنے آپ کو 'ملک' یعنی بادشاہ بھی کہلانے لگے اگرچہ وہ خود شریعت مطہرہ کے تابع ہونے کا اقرار کرتے تھے اور ان کے ملک میں شریعت ہی نافذ تھی۔ خلاصہ یہ کہ مسلمانوں میں کبھی بھی 'ریاست' کی اصطلاح استعمال نہیں ہوئی اور اس کے لیے خلافت وامارت کے الفاظ استعمال کیے گئے کیونکہ ہر مسلمان، خواہ وہ عامی ہو یا خلیفہ یا امیر المومنین، وہ اللہ کا عبد ہوتا ہے، خود مختار اور مختار مطلق نہیں ہوتا۔

---

[۱] ص ۳۸:۲۶

لیکن مغرب میں جب سٹیٹ (State) کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مراد ہوتی ہے نیشن سٹیٹ یعنی ریاست وہاں قوم سے بنتی ہے اور قوم بنتی ہے رنگ، نسل، زبان، علاقے کی یکسانیت سے۔ پھر ریاست وہاں مرکز اطاعت اور مرکز گناہ وثواب اور مرکز ترجیح ہوتی ہے۔ میرا وطن، میری قوم، میری ریاست سب سے اعلیٰ، سب سے برتر۔ پھر یہ ریاست جمہوری ہوتی ہے یعنی عوام کے منتخب نمائندے جو قانون چاہیں بنا سکتے ہیں، جس حلال کو چاہیں حرام قرار دے سکتے ہیں اور جس حرام کو چاہیں حلال قرار دے سکتے ہیں۔ پھر یہ ریاست لبرل ہوتی ہے یعنی اس میں افراد کو ہر قسم کی مادر پدر آزادی میسر ہوتی ہے بغیر کسی حدود اور شروط کے (الا یہ کہ وہ کوئی پابندی اپنی عقل سے اپنے اوپر عائد کر لیں) مثلاً ان کے ہاں شراب پینے کی اجازت ہے لیکن اگر آپ نے ڈرائیونگ کرنی ہے تو ایک خاص حد سے زیادہ نہیں پی سکتے ورنہ آپ کا چالان ہو جائے گا۔ اس ریاست میں دولت اور سرمائے کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ انتخابات جیت کر اقتدار میں آنے کے لیے بھی اور اقتدار میں رہنے کے لیے بھی۔ ظاہر ہے کہ کوئی مسلمان ایسی ’ریاست‘ کو اسلامی نہیں کہہ سکتا اور نہ ایسی ریاست کو ’ریاستِ مدینہ‘ کہا اور بنایا جا سکتا ہے۔

ریاست وجمہوریت بمقابلہ خلافت وامارت

ابتداء اسلام میں خصوصاً خلافت راشدہ میں خلافت کے تصور پر صحیح انداز میں کام ہوا لیکن بتدریج اس میں کمزوریاں آتی گئیں۔ اس کے باوجود وہ نظام بارہ سو سال تک امت کے اتحاد اور اس کی عزت وعظمت کا نگہبان رہا۔ ۱۹۲۴ء میں مغربی فکر وتہذیب کے غلبے سے متاثر ہو کر اتا ترک اور اس کے ساتھیوں نے اس نظام خلافت کی قبا چاک کر دی اور مغرب کی پیروی کرتے ہوئے اس کے سیکولر جمہوری ریاستی نظام کو اپنا لیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد مسلمان مما لک ایک ایک کر کے مغربی استعمار سے آزاد ہو گئے لیکن مسلم اہل دانش اور اہل علم نے دوں ہمتی سے کام لیا اور خلافت کے نظام پر نظر ثانی کر کے اسے بہتر بنانے یا از سر نو اسلام کا تفصیلی سیاسی نظام وضع کرنے کی بجائے مغربی تہذیب کے سیاسی نظام میں کچھ رخ اندوزی (یعنی پیچ ورک) کر کے اسے اپنا لیا مثلاً مغرب کی سیکولر اور لبرل جمہوریت میں کچھ اسلامی اصول داخل کر کے اسے ’اسلامی جمہوریت‘ قرار دے لیا۔ ظاہر ہے دینی اور فکری لحاظ سے یہ ایک کمزور

اور غلط فیصلہ تھا لہٰذا ناکام ثابت ہوا اور اسلامی ملکوں میں خصوصاً پاکستان میں اس کے نتیجے میں منطقی طور پر اسلام غالب آنے کی بجائے مغرب تہذیب کے افکار و اقدار غالب آ گئے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ مغربی جمہوریت یا اسلام اور مغرب کے سیاسی نظام کے اس ملغوبے یعنی اسلامی جمہوریت کے ذریعے ریاست مدینہ قائم نہیں ہو سکتی۔ ریاست مدینہ قائم کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے اسلام کا سیاسی نظام خلافت کی اساس پر تشکیل دیا جائے، مغرب کے سیاسی نظام کی اندھی نقالی کیے بغیر، اور پھر اس کے ذریعے 'ریاست مدینہ' بلکہ اس کی صحیح تعبیر یہ ہے کہ مدینہ جیسی خلافت و امارت قائم کی جائے جس طرح کہ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کی تھی جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

یہاں یہ بات نوٹ کی جائے کہ ہمارا حریف یا دشمن بڑا چالاک ہے۔ پہلے اس نے اپنے گماشتہ لوگوں (اتاترک اور اس کے گروپ سے) خلافت ختم کروائی۔ پھر اس کے بعد مسلم ممالک کو ٹکڑوں میں تقسیم کیا اور ان کو کبھی متحد نہیں ہونے دیا بلکہ ان کے نظام تعلیم کو بدل دیا اور اس میں سے 'امت' اور 'اتحاد' کا ذکر ہی حذف کر دیا۔ پھر اس نے سازش سے 'داعش' کو خلافت کا علمبردار ظاہر کیا اور اس میں اپنے آدمی داخل کیے جنہوں نے لوگوں پر غیر انسانی تشدد کیا اور دہشت گردی کا رویہ اختیار کیا۔ یوں انہوں نے خلافت کی اصطلاح کو بدنام کیا اور آج کوئی بھی مسلمان حکمران 'خلافت' کا نام لینے کی ہمت نہیں کرتا۔ مسلمانوں میں سے جو تحریکیں خلافت کا نعرہ لگاتی ہیں، انہیں مغرب مسلمان حکمرانوں کے ذریعے کچل دیتا ہے۔ انہیں دہشت گرد، متشدد اور غیر جمہوری کہنے کا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے تاکہ کوئی خلافت اور امارت کا نام نہ لے۔ دوسری طرف مغربی جمہوریت کے حق میں پروپیگنڈا کرنے کے لیے کروڑوں اربوں ڈالر مختص کیے جاتے ہیں اور علی الاعلان مسلم ملکوں میں جمہوریت نافذ کرنے کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ انہیں 'مہذب' سویلائزڈ، جمہوری اور سیکولر بنایا جا سکے۔

مدینہ کی 'ریاست' کیسے قائم ہوئی تھی؟

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ریاست مدینہ یا صحیح تر لفظوں میں مدینہ میں خلافت یا امارت کا نظام کیسے قائم کیا تھا؟ اس کے لیے ہمیں اپنی طرف سے سر کھپانے

یا ٹامک ٹوئیاں مارنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں چار دفعہ [۱] یہ بتایا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو کام کرنے کا کیا طریقہ سکھایا تھا۔ اسے اختصار کے ساتھ [illegible] کہا جاسکتا ہے۔یعنی فرد کو تبدیل کیا جائے قرآن حکیم کی تعلیم دے کراوراس کی روشنی میں عقلی علوم کی تعلیم دے کراوراس کے نفس کا تزکیہ کرکے۔یعنی کتاب وحکمت کی تعلیم اس طرح دی جائے کہ وہ ان کے فکروعمل کی بنیاد بن جائے۔اس کی شخصیت اس پرعمل میں ڈھل جائے اور اللہ کے احکام پر عمل کرنا اس کے لیے سہل اور مرغوب ہوجائے۔

اس طرح کے افراد جب تیار ہوگئے تو ان کا ایک معاشرہ اور ایک کمیونٹی وجود میں آ گئی جس کو اگلے مرحلے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ایک ریاست یعنی خلافت وامارت کی شکل دے دی۔یعنی اسلامی خلافت وامارت کے قیام کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے افراد کو اسلامی تعلیم وتزکیہ کے ذریعے تبدیل کیا جائے، پھر ایسے افراد پر مشتمل معاشرہ قائم ہو۔ پھر اس کے ذریعے اسلامی خلافت وامارت قائم کی جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی طرح مدینہ میں خلافت وامارت قائم کی تھی اور یہی اسلامی خلافت وامارت کے قیام کی فطری ومنطقی ترتیب ہے۔لہٰذا جو لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ مغربی طرز کی جمہوری ریاست میں سیاسی جدوجہد کرکے ریاست مدینہ قائم کرلیں گے، وہ خلط مبحث اور فکری ژولیدگی کا شکار ہیں۔ یا تو وہ اسلام کو نہیں سمجھتے یا مغرب اور اس کی فکروتہذیب کو، کیونکہ ان دونوں میں بُعد المشرقین ہے اوران کے امتزاج سے کوئی مفید مرکب تیار نہیں کیا جاسکتا۔یہ تو ایسے ہی ہے جیسے جو بیج کر گندم اگنے کی توقع کی جائے۔

مدینہ کی ’ریاست‘ کیسے قائم ہوسکتی ہے؟

یہاں یہ غلط فہمی بھی دور کرلی جائے کہ مغربی تہذیب کی پیداوار سٹیٹ یا ریاست کا آئین اور قانون اسلامی بنادینے سے اسلامی ریاست یا ریاست مدینہ قائم ہوجائے گی۔ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا جس کی زندہ مثال یہ ہے کہ پاکستان میں جنرل ضیاء الحق نے اپنی ناقص عقل وفہم کے مطابق ۱۹۷۹ء میں ’اسلامی حدود‘ پاکستان میں نافذ کردی تھیں لیکن اس کے نتیجے میں

---

[۱] البقرہ۲:۱۲۹،البقرہ۲:۱۵۱،آل عمران ۳:۱۶۴،الجمعہ ۶۲:۲

۷۰ سال گزرنے کے باوجود پاکستان میں آج تک ایک بھی چور کا ہاتھ نہیں کٹا، ایک بھی زانی سنگسار نہیں ہوا اور ایک بھی شرابی کو کوڑے نہیں لگے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ موجودہ پولیس اور عدالتوں کے ذریعے اور موجودہ جمہوری حکمرانوں کے ذریعے اسلام نافذ ہو اور ریاست مدینہ وجود میں آئے۔ اس کے لیے آپ کو سارا نظام جڑ بنیاد سے ٹھیک کرنا پڑے گا اور اس کی ابتداء فرد کی تبدیلی سے کرنا پڑے گی۔ مثلاً جب آپ ایک جج کے اندر اللہ کا خوف پیدا کر دیں گے اور اسے اسلام کا قانون (قرآن وسنت اور فقہ واصول فقہ) پڑھا دیں گے تو وہ سارے فیصلے اسلام کے مطابق کرے گا نہ کہ کسی اور قانون کے مطابق۔ اور جب آپ کسی پولیس آفیسر کی تعلیم وتربیت اسلام کے مطابق کر دیں گے تو وہ نہ کسی مظلوم سے رشوت لے گا اور نہ اس کے ساتھ ظلم وزیادتی کرے گا۔ اس بات کو مملکت کے سارے شعبوں پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ بات صحیح ہے کہ خلافت وامارت کا نظام صحیح خطوط پر چلانے کے لیے صرف فرد اور معاشرے کی اصلاح کافی نہیں بلکہ خلافت وامارت کا سیاسی نظام اور ہیئت مقتدرہ یعنی خلیفہ وامیر اور اس کی شوریٰ اور اہل حل وعقد اور عدلیہ، فوج، بیوروکریسی، میڈیا اور پولیس وغیرہ کا نظام درست کرنا بھی ضروری ہے تاکہ امیر اور حکمران طبقے اور مسلمان عوام سب اسلام کے زندگی بخش نظام کو اپنانے کے لیے دل وجان سے تیار ہوں۔

عصرِ حاضر میں مدینہ کی ریاست کیسی ہوگی؟

آخری بات یہ کہ اسلام کے نظام خلافت وامارت اور فرد میں نچلی سطح پر اسلامی تبدیلی کی بات سمجھنے کے باوجود لوگ ایک ملموس اور مانوس انداز میں یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ ریاست مدینہ یا اسلامی ریاست یا ہمارے لفظوں میں اسلامی خلافت وامارت کے خدوخال عصر حاضر میں کیا ہوں گے؟ ہم اس ضمن میں یہ کر سکتے ہیں کہ اس غرض سے آج کے ریاستی ڈھانچے میں مطلوب تبدیلیوں کا ایک نقشہ اور خاکہ آپ کے سامنے رکھ دیں تاکہ ایک عام آدمی عصر حاضر کی مجوزہ ریاست مدینہ کا ایک تصور اپنے ذہن میں قائم کر سکے۔ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے کہ فرد اور معاشرے کی اصلاح کے بغیر مجوزہ ریاست مدینہ قائم نہیں ہو سکتی لہٰذا ہم ابتداء کریں گے ان شعبوں کے ذکر سے جو انسان کی شخصیت سازی میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

شخصیت سازی کے شعبے

سب سے بڑی اور بنیادی ضرورت اس امر کی ہے کہ شخصیت سازی کے ذرائع کی اصلاح کی جائے یعنی تعلیم، تزکیہ اور میڈیا کی۔ اس کی کچھ تفصیل درج ذیل ہے:

تعلیم وتربیت: موجودہ نظام تعلیم وتربیت کو بدل کر اسے اسلامی تقاضوں کے مطابق بنایا جائے۔ جدید تعلیم اور دینی مدارس کی تعلیم کی موجودہ ثنویت ختم کردی جائے اور نظام تعلیم اور نصاب ایک ہی ہو۔ عام آدمی کے لیے ایسا کہ اسے ایک عملی مسلمان (Practicing Muslim) بنائے اور اسے دین کی بنیادی تعلیم دے اور دینی اقدار کے مطابق اس کی تربیت کرے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں درکار اہلیتیں اور مہارتیں (Skills) ان میں پیدا کرے۔ عالم دین بننے کے لیے تخصص کا الگ انتظام ہو جیسا کہ اس وقت میڈیسن اور انجینئرنگ کے لیے ہے۔ یہ نصاب ایسا ہو جو عصری ضروریات اور تقاضے پورا کرنے والا بھی ہو اور ماضی کے علمی ورثے سے مربوط کرنے والا بھی ہو اور مسلک پرستی کا خاتمہ بھی کرے۔ اس کے لیے موجودہ نصابات بدلنے پڑیں گے، اساتذہ اور تعلیمی اداروں کے منتظمین کی خصوصی تربیت کی ضرورت ہوگی تاکہ وہ یہ سیکھیں کہ خود اپنی تربیت کیسے کرنی ہے اور بچوں کو عملی مسلمان کیسے بنانا ہے۔ اس کے لیے ہر تعلیمی ادارے میں ایک تربیت کمیٹی بنانا ہوگی جو بچوں کی اسلامی تربیت کے امور کی نگران ہو۔

تزکیۂ نفس: نسلِ نو کی صحیح تعلیم وتربیت کے ساتھ بڑوں (Grown ups) کے تزکیے کے لیے مختلف علمی اور معاشرتی سطحوں کی تربیت گاہیں بنائی جائیں جن کا نصاب ایسا ہو کہ وہ انہیں دین پر عمل کرنا سکھائے اور وہ وہاں سے عملی مسلمان بن کر نکلیں۔ ماضی میں حکمران طبقے اور معاشرے کے خوشحال لوگ اس طرح کی تربیت گاہوں کی مالی سرپرستی ایک خوشگوار دینی فریضہ سمجھ کر کرتے رہے ہیں اور وہ آج بھی کر سکتے ہیں اور اگر اس نظام کو وسیع پیمانے پر منظم کرنا ہو تو مقامی NGOs کے ذریعے انہیں No Profit, No Loss کی بنیاد پر بھی چلایا جاسکتا ہے اور شرکاء اپنے اخراجات خود برداشت کرسکتے ہیں۔ ایسی تربیت گاہوں کا موزوں نصاب اور لائحہ عمل بنایا جاسکتا ہے جو افراط وتفریط اور مسلک پرستی سے پاک ہو اور عصری

مزاج کے قریب ہو۔

میڈیا: موجودہ میڈیا (پرنٹ، الیکٹرانٹ اور سوشل میڈیا تینوں) کی اصلاح اشد ضروری ہے اور یہ ناممکن نہیں لیکن اس کے لیے کچھ باتیں ناگزیر ہیں: ایک یہ کہ پہلے لوگوں کی ذہن سازی کی جائے۔ مدیروں، صحافیوں، مالکوں، پروڈیوسروں، اینکر پرسنز، ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کا سٹاف سب کی تربیت کی جانی چاہیے۔ نیز ان سب کے لیے ایک ضابطہ اخلاق ہونا چاہیے جس کی کڑی نگرانی ہو۔ حکمران طبقہ اور نفاذ قانون کے ذمہ دار اداروں کے افراد کی سمت بھی واضح ہو اور انہیں زندگی کو اسلامی خطوط پر ڈھالنے کے لیے درکار شرحِ صدر بھی حاصل ہو۔ نیز وہ اس کا سلیقہ بھی رکھتے ہوں اور اس کے لیے قانون کی حمایت بھی انہیں حاصل ہو۔

اہم نوٹ

یہ بات ذہن میں رکھیے کہ مغرب آپ کو یہ سب نہیں کرنے دے گا، اگرچہ یہ آپ کا حق ہے کہ آپ جس طرح کی انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنا چاہیں بحیثیت ایک آزاد قوم کے گزار سکیں لیکن یہ محض ہاتھی کے دکھانے کے دانت ہیں۔ اس کے کھانے کے دانت اور ہوتے ہیں لہٰذا اس کے لیے ضروری ہے کہ:

۔ آپ مغرب کے زیر دست نہ ہوں، مالیات اور دیگر کسی شعبے میں اس کے محتاج نہ ہوں اور آپ میں اتنی ہمت ہو کہ اہل مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکیں اور ان کی مرضی اور خواہش کے علی الرغم اپنی مرضی کر سکیں۔

۔ اس کے لیے دو چیزیں ضروری بلکہ بالکل ناگزیر ہیں۔ ایک یہ کہ آپ کو اپنے عوام کی پشت پناہی سو فیصد حاصل ہو اور اس بارے میں آپ بالکل یکسو ہوں۔ دوسرے یہ کہ سارے مسلم ممالک آپ کی پشت پر ہوں۔ مسلم امت متحد ہو۔ اگر کچھ ممالک امریکی و یورپی خوشنودی چاہتے ہوں اور ان کے سامنے گردن اٹھا کر بات نہ کر سکیں تو امریکی خوشامد میں وہ آپ کی مخالفت کرنے کے لیے بڑی دور تک چلے جائیں گے بلکہ مغرب انہیں آپس میں لڑا دے گا جیسا کہ کئی دفعہ ہو چکا ہے۔

۔ ملّا عمرؒ کا قصور یہ نہیں تھا کہ اس نے اسامہ بن لادن کو پناہ دی تھی بلکہ اس کا اصل جرم

یہ تھا کہ وہ ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف سے قرضے لینے کے لیے تیار نہ تھا، وہ مغرب کی جمہوریت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اور اہل مغرب کے تعلیمی نظام اور میڈیا کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔۔۔۔اور یہ ایسے جرائم ہیں کہ مغربی طاغوت اس کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔قذافی اور صدام کو دار پر لٹکا دیا گیا اور ان کے ملک تباہ کر دیے گئے تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ سر اٹھا کر چلنا چاہتے تھے جب کہ امریکہ و یورپ کا حکم مسلمانوں کے لیے یہ ہے کہ ؎
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

شخصیت سازی کے ذرائع کے بعد آیئے اب دیکھیں کہ اگر عصر حاضر میں اسلامی خلافت وامارت یا جیسا کہ غلط العام ہے کہ 'ریاست مدینہ' کے قیام کے لیے جو چیزیں درکار ہیں، ان کا اگر تصوراتی نقشہ کھینچا جائے تو وہ کیسا ہوگا؟

انتظامیہ (Executive)

ضروری ہے کہ سربراہ مملکت (خواہ وہ وزیر اعظم ہو یا صدر) دین کا عالم ہو، متقی ہو، عوام کی حمایت رکھتا ہو اور ملک چلانے کی صلاحیت اس میں موجود ہو۔ ان خصوصیات کو قانونی شکل دینے اور اس کے عملی حصول کے لیے لائحہ عمل وہ ''نظام العمل'' دے گا جو اسلامی خلافت وامارت کا نظام چلانے کے لیے 'مجلس اجتہاد' اور 'مجلس شوریٰ' وضع کریں گی جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

اہم نوٹ

اس 'نظام العمل' کا پہلا اور بنیادی اصول یہ ہوگا کہ قرآن وسنت مسلمانوں کا بنیادی آئین ہیں اور یہ نظام العمل (جو مسلمانوں کی عملی، انتظامی اور سیاسی ضروریات پوری کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے) اور اس کے مطابق قائم کیے جانے والے ادارے سب قرآن وسنت کے ماتحت اور اس پر عمل کے پابند ہوں گے۔

مقننہ

جس شعبے کو آج کل مقننہ کہا جاتا ہے وہ مسلمان فقہاء اور مجتہدین پر مشتمل 'مجلس اجتہاد'

ہوگی۔اس مجلس کی تشکیل اوراس کے ارکان کی اہلیت کے بارے میں 'نظام العمل' میں تفصیلات دی جاسکتی ہیں۔اس کی مساعدت کے لیے عوام کے مختلف طبقات کے نمائندوں، وجوہ القوم اورسرداران معاشرہ پر مشتمل ایک مجلس شوری ہوگی۔مجلس شوری کی تشکیل کا طریقہ بھی نظام العمل میں واضح کر دیا جائے گا۔ ہر معاملہ پہلے مجلس شوری کے پاس جائے گا۔وہاں اس پر بحث ہوگی پھر یہ معاملہ مذکورہ مجلس اجتہاد کو ریفر کر دیا جائے گا جس کا فیصلہ حتمی ہوگا۔اس مجلس اجتہاد کے فیصلوں کے بارے میں اگر کوئی وضاحت درکار ہوتو اسی مجلس سے رجوع کیا جائے گا۔یہ مجلس اجتہاد الگ بھی ہوسکتی ہے اور اسے شوری کا حصہ بھی بنایا جاسکتا ہے۔

عدلیہ

عدلیہ کا کام خصومات وتنازعات کا فیصلہ کرنا ہے۔ضروری ہے کہ اس کے ارکان قرآن وسنت اور فقہ واصول فقہ کا خصوصی علم رکھتے ہوں اور متقی ہوں۔اس کے لیے خصوصی نصاب اور خصوصی تعلیمی اداروں کی ضرورت ہوگی جن سے تحصیل کے بغیر کوئی شخص قاضی (جج) نہیں بن سکے گا۔اعلیٰ عدالتوں کے قاضیوں کا معیار مجتہد جیسا ہونا چاہیے اور اس کا ذکر 'نظام العمل' میں ہونا چاہیے۔ساری عدالتیں قرآن وسنت کے مطابق فیصلے کرنے کی پابند ہوں گی اور یہ انصاف فوری اور سستا ہوگا۔عدالتیں مجوزہ 'نظام العمل' کی بھی پابندی کریں گی اور جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا کہ خود 'نظام العمل' بھی قرآن وسنت کا پابند ہوگا اور اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہوگی جو قرآن وسنت کے خلاف ہو۔قضاۃ اگر چاہیں تو فقہاء اور مفتیوں سے مدد لے سکتے ہیں۔وکیلوں کے موجودہ طبقہ کی ضرورت نہ ہوگی۔تاہم مدعی یا مدعا علیہ کسی خاص صورت میں اگر چاہیں تو کسی شخص کو اپنا وکیل بنا سکتے ہیں۔اس وکیل میں بھی ظاہر ہے فقیہ اور مفتی کی صفات ہونی چاہئیں اور اس کا کام مدعی یا مدعا علیہ کا موقف عدالت کے سامنے واضح کرنا ہو نہ کہ کسی مجرم کو سزا سے بچانا۔اگر کوئی وکیل کسی مجرم کو سزا سے بچانے کی کوشش کرے گا تو وہ مستوجب سزا ہوگا۔

جیسا کہ پہلے گزر چکا کہ اس کے لیے ناگزیر ہے کہ قرآن وسنت اور فقہ واصول فقہ کی تعلیم کے لیے خصوصی تعلیمی ادارے ہوں جن کی ڈگری کے بغیر نہ کوئی شخص قاضی نہ بن سکے، نہ مفتی اور فقیہ بن سکے اور نہ وکیل۔ہاں! ان کی معلومات میں اضافے کے لیے اقوام متحدہ اور

مغربی ممالک کے آئین وقوانین اوراصول قوانین کا مطالعہ انہیں ضرور کرانا چاہیے۔

بیوروکریسی اور فوج بھی دیکھا جائے تو انتظامیہ کے تحت آتی ہے لیکن عصر حاضر میں ان کی خصوصی اہمیت کے پیش نظر ہم ان کے بارے میں بھی کچھ تجاویز غور وفکر کے لیے اہل علم کی خدمت میں پیش کرتے ہیں: بیوروکریسی کے ممبران کے چناؤ کے لیے اس وقت جو نصاب مقرر ہے اس کا ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے۔ ظاہر ہے یہ غلط ہے اور ذریعۂ تعلیم اردو ہونا چاہیے اور قرآن وسنت اور فقہ واصول فقہ ان کے مرکزی مضامین ہونے چاہئیں جن کے لیے عربی زبان میں مہارت ضروری ہے۔ ان افراد کی اسلامی تربیت کا خصوصی اہتمام ہونا چاہیے تاکہ وہ عام مسلمانوں کو اپنے جیسا مسلمان سمجھیں، ان کی عزت وتوقیر کریں اور ان کے مسائل ومشکلات حل کرنے کی کوشش کریں اور خوف خدا کی وجہ سے رشوت وعطایا کے قریب بھی نہ پھٹکیں۔

فوج کے سپاہیوں خصوصاً ان کے افسروں میں جذبۂ جہاد پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی اسلامی تربیت کا موثر انتظام ہو۔ اس کے لیے فوجی تربیتی اداروں کی تنظیم نو اور نصاب کی تبدیلی ناگزیر ہے۔ افسروں میں تقویٰ اور اللہ کی راہ میں جان دینے کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ان کی معاشرت بھی اسلامی ہونی چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کے میس (Mess) کے موجودہ رنگ ڈھنگ کو بدلا جائے اور ملازموں کی فوج ظفر موج سے ان کو چھٹکارا دلایا جائے۔ امریکہ ویورپ میں ان کی تربیت کو ختم کیا جائے۔ سارا اسلحہ خود تیار کیا جائے کہ اس بارے میں خود کفالت ناگزیر ہے۔

یہ ایک مختصر ساخاکہ ہے کہ آج اگر 'ریاست مدینہ' قائم کرنی ہو تو وہ کیسے قائم ہوسکتی ہے اور وہ کیسی ہوگی؟

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں انفرادی اور اجتماعی زندگی اپنی تعلیمات کے مطابق گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اسلام اور پاکستان پروفیسر ملک محمد حسین

پاکستان میں سیکولرزم کی پیش قدمی اور اسلامیت کی پسپائی

پاکستان مظاہر کے لحاظ سے اسلامی، مزاج کے لحاظ سے جذباتی اور کردار کے لحاظ سے سیکولر ہے۔ پاکستان مظاہر کے لحاظ سے اسلامی اس طرح ہے کہ اسلام کا سب سے بڑا اور عظیم مظہر مسجد ہے۔ اب پاکستان کا کوئی شہر، کوئی محلہ، کوئی بستی، کوئی گاؤں، کوئی ڈیرہ، کوئی ڈھوک اور کوئی گوٹھ ایسی نہیں ملے گی جہاں مسجد نہ ہو۔ کوئی سڑک، کوئی شاہراہ ایسی نہیں جہاں قدم قدم پر آپ کو مسجد نہ ملے۔ آزاد کشمیر میں جائیں تو مین مشاہراہوں پر مساجد کا ایک سلسلہ ملے گا جن کا ڈیزائین اور ماحول ایک جیسا ہے۔ میں نے ضلع خوشاب میں خوشاب چکوال روڈ پر خوشاب سے کٹھہ سگھرال جو کوہستان نمک کے دامن میں واقع ہے اور ۲۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، آتے جاتے مین روڈ پر بنی مساجد گنیں جو تعداد میں ۲۵ تھیں۔ حفظ قرآن کا ایک کلچر ہے جو پھیلتا جا رہا ہے پہلے پورے پورے گاؤں میں کوئی حافظ نہیں ملتا تھا اور اب ایک ایک گھر اور خاندان میں کئی کئی حافظ مل جاتے ہیں۔ رمضان شریف میں مصلے سنانے یعنی تراویح پڑھانے کے لیے حافظ صاحبان کو جگہ نہیں ملتی لہٰذا گھر گھر تراویح پڑھائی جا رہی ہوتی ہے۔

درس قرآن کے سلسلے ہیں کہ گنتی میں نہیں آتے اور اب تو یوٹیوب پر اور فیس بک پر درس قرآن دینے والوں کی ماشاء اللہ بھر مار ہے۔ محافل نعت اور مجالس عزا کے سیکڑوں ہزاروں سلسلے ہیں جن کی اپنی ایک روحانی قدر و قیمت ہونی چاہیے۔ ملک میں ہزاروں تبلیغی گشت ہر ہر روز جاری رہتے ہیں اور اس پر متزاد دینی اجتماعات ہیں۔ تبلیغی جماعت کے، دعوتِ اسلامی کے، جماعت اسلامی، تحریک اسلامی اور تنظیم اسلامی کے کہ جن میں ہزاروں لاکھوں لوگ دور دراز سے بستر اٹھائے، سفر کر کے امنڈے چلے آتے ہیں۔ ٹی وی چینلز کے دینی پروگرامز اس کے علاوہ ہیں اگرچہ ان پروگراموں کے وقفوں کے درمیان فحاشی، برہنگی اور اباحیت کے تڑکے بھی بالافراط ہوتے ہیں۔ رمضان شریف کے دوران تو ٹی وی چینلز اپنے رنگین اور توبہ

شکن مذہبی پروگراموں کے ذریعے پوری کوشش کرتے ہیں کہ لوگ ان کے ساتھ ہی مصروف رہیں اور عبادت کی سرگرمیوں میں شامل نہ ہوسکیں۔

سطورِ بالا میں ہم نے اسلامی مظاہر کی بات کی۔ اب آتے ہیں اسلامی جذباتیت کی طرف۔ ذرا سی کہیں افواہ اُڑی اور ہم اُڑ پڑے۔ قارئین محترم کو شاید یاد ہوگا کہ کعبہ شریف پر حملہ کی افواہ اڑی کہ امریکہ نے حملہ کردیا ہے اور یار لوگ پٹرول کے کنستر لے کر امریکی سفارت خانے کی طرف دوڑ پڑے۔ اسے جلانے کی کوشش کی اور سنگسار کیا۔ اسی طرح آئے دن تشدد کے واقعات ہوتے رہتے ہیں جس میں اسلامی جذبات کے پجاری سوچے سمجھے بغیر تباہی پھیلاتے رہتے ہیں۔ اس عمل میں نہ افراد پیچھے رہتے ہیں نہ جماعتیں۔ نیم تعلیم یافتہ مولوی حضرات کا تو اوڑھنا بچھونا ہی جذبات سے کھیلنا ہے۔ ان کی روزی روٹی انہی اسلامی جذبات کی مرہون منت ہے۔ اشو پیدا کرتے ہیں، پھر نمک مرچ لگاتے ہیں اور سادہ لوح مسلمانوں کے جذبات کو انگیخت کر کے کٹھ پتلیوں کو نچاتے ہیں اور پھر بیٹھ کر تماشا بھی دیکھتے ہیں اور استغفار بھی کرتے ہیں۔ بیچارے علمائے حق دیکھتے ہی رہ جاتے ہیں اور جذبات کے عوامی سیلاب کے سامنے کچھ بھی نہیں کر پاتے۔ یہ ہمارے معاشرے کے وہ حقائق ہیں جن کا ہم سامنا کر رہے ہیں۔ جذبات کی اس آگ پر دین حنیف کا پانی ڈالے بغیر معاشرہ اسلامی نظریۂ حیات کے حق پرست راستے پر نہیں چل سکتا۔

اب ہم آتے ہیں اس معاملے کی طرف کہ پاکستانی معاشرہ کردار کے لحاظ سے سیکولر ہے نیز مغربی سیکولرزم اور لبرلزم تیزی سے معاشرے میں سرایت کر رہا ہے۔ مغربی سیکولرزم اور لبرلزم کا سب سے بڑا ہتھیار تعلیم ہے۔ عصری تعلیم کبھی اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق تشکیل نہیں پاسکی۔ لارڈ میکالے نے برصغیر ہندوپاک کے مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کو بدلا۔ اس کے بقول ہندوستانیوں کو ایسی تعلیم دی جائے گی کہ وہ رنگ و آہنگ میں تو ہندوستانی ہی رہیں لیکن اپنے فکر و تدبر میں اور اپنی بود و باش میں انگریز بن جائیں۔ مسلمانوں نے نظریاتی سطح پر لارڈ میکالے کی سازش کا مقابلہ اس طرح کیا کہ بنگال سے افغانستان کی سرحد تک دینی تعلیم کے مدارس کا ایک جال بچھا دیا اور اس طرح اگرچہ عصری تقاضوں سے ذرا ہٹ گئے لیکن دینی تعلیم، دینی فکر اور دینی چہرے زندہ رکھے۔ معاشرے کی دینی فکر اتنی توانا تھی کہ لارڈ میکالے کے

نظامِ تعلیم میں پرورش پانے والوں میں بھی علامہ ڈاکٹر محمد اقبال، محمد علی جناح، ڈاکٹر رفیع الدین، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ظفر علی خان، حمید نظامی، مولوی عبدالحق، چوہدری محمد علی، اکبر الٰہ آبادی، مختار مسعود اور اسی طرح کے ملی اسلامی سوچ کے حامل بیسیوں افراد قوم کو میسر آئے جنہوں نے قیامِ پاکستان کے بعد ملک کو اسلامی پٹڑی پر ڈالنے کی ان تھک کوشش کی۔ انگریزوں کے قبضے کے دور تک یہ قوم سخت جانی کا مظاہرہ کرتی رہی لیکن بعد میں آہستہ آہستہ بند ٹوٹنے لگا اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ سیکولرزم ولبرلزم پوری طرح معاشرے پر حاوی ہو چکا ہے۔ اسلامی رنگ بھی موجود ہے لیکن وہ سطحی اعمال اور جذباتی نعروں تک محدود ہے، باطن تقریباً سب کا سیکولر ولبرل ہو چکا۔

کئی ایک عوامل ہیں جنہوں نے کام کر دکھایا ہے۔ سب سے پہلا عامل تعلیم ہے۔ پاکستان بننے کے بعد اسلامیات کا مضمون تو موجود رہا بلکہ سکول سطح سے لے کر ماسٹر ڈگری کے کورسوں تک پھیل گیا لیکن باقی تعلیم اور تعلیمی نصاب سیکولر رہا۔ ہر آئے دن تعلیم، تعلیمی نصاب اور درسی مواد کی نوعیت اور طبیعت میں سیکولر عنصر کا اضافہ ہی ہوا ہے۔ اعلیٰ تعلیم تو مکمل طور پر مغربی فکر وتہذیب کا مظہر ہے۔ نعرہ اسلام کا لگتا ہے لیکن بول بالا سیکولر لبرل اقدار کا ہوتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ طلباء کی اسلامی شخصیت کو پروان چڑھانے کے لیے اسلامی اقدار کو تعلیمی نظام میں سمویا جاتا۔ انگریزی کی بجائے قومی زبان کا فروغ ہوتا اور ہر سطح کی تعلیم اردو میں دی جاتی۔ تعلیم کو طبقاتی تقسیم کا ذریعہ بنانے کی بجائے قومی یکجہتی اور معاشرتی ہم آہنگی کا ذریعہ بنایا جاتا۔ تعلیم کا حصول اور تعلیم کی فراہمی دولت کی بنیاد پر استوار کرنے کی بجائے میرٹ، ضرورت، صلاحیت اور برابری کی بنیاد پر استوار ہوتی لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا جیسا کہ ہونا چاہیے تھا اور یہی ذریعہ بنا سیکولرزم لبرلزم کے فروغ کا۔ اس دوڑ میں کوئی طبقہ پیچھے نہیں رہا۔ نہ غریب، نہ اشرافیہ، نہ مسٹر، نہ مولوی، نہ ماڈرنسٹ، نہ اسلامسٹ اور نہ دیہاتی، نہ شہری۔ سب سے زیادہ ظلم اسلامسٹوں نے ڈھایا کہ ''قرآن کی تعلیم اور کمپیوٹر کی تعلیم'' ساتھ ساتھ، اور ''انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ اسلامی شخصیت کی تعمیر'' جیسے دلکش لیکن سطحی نعروں کے ساتھ انگریزی کی تعلیم، آکسفورڈ اور کیمبرج کا سلیبس اور او لیول، اے لیول کے امتحانات کو قوم کے

اسلامی ذہن کے لیے بھی قابل قبول بنایا۔ پہلے بھی عیاں تھا لیکن اب جو رائے منظور ناصر نے بیرونی نصابات اور درسی کتب کے غیر اسلامی اور ملحدانہ مواد کا پول کھولا ہے اس کے ہوتے ہوئے چند دعائیں یاد کرا دینے اور اسلامی ٹیبلو پر فارم کرانے سے اسلامی شخصیت کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ اشرافیہ (Elite) کے سکولوں نے تو مغرب کے سکولوں سے کہیں بڑھ کر اباحیت اور الحاد پھیلایا ہے۔

سرکاری قومی نصابات میں پہلے بھی کوئی زیادہ اسلام نہیں تھا لیکن درسی کتب میں حمد و نعت، اقبال کی نظمیں، سبق آموز اسلامی کہانیاں، سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، صحابہ کرامؓ اور اولیائے عظام کی زندگی کی جھلک کہیں کہیں نظر آ جاتی تھی۔ محمود غزنوی اور صلاح الدین ایوبی کا مجاہدانہ کردار مسلمان طلبہ میں کچھ کچھ زندگی کی رمق پیدا کرتا رہتا تھا لیکن اب سنگل نیشنل کریکولم کے نام سے جو عفریت قوم کے ذہنوں میں سوار کیا جا رہا ہے اس میں اسلامی اقدار کی بجائے ہیومنزم کی اقدار کو سمویا جا رہا ہے۔ اسلامیات کا مضمون تو غنیمت ہے لیکن باقی مضامین سے اسلامی مواد اور اسلامی حوالے معدوم کیے جا رہے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم تو اس سلسلہ میں خصوصاً سیکولر و لبرل حوالوں سے مزین ہے۔ حد یہ ہے کہ یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اسلامیات بھی اپنے سٹرکچر کے لحاظ سے مغربی روایات پر قائم ہیں۔ سوشل سائنسز کے شعبہ جات میں اسلامی حوالہ سب سے نمایاں ہونا چاہیے تھا لیکن وہاں تو خالص سیکولر فکر ہی حکمران ہے۔

تعلیم کے بعد سیکولرزم اور لبرلزم کے پھیلاؤ کی دوسری وجہ مفادات ہیں۔ اگر آپ کا چہرہ اسلامی ہے تو آپ اس سیکولر ماحول میں آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اپنی جگہ بنانے کے لیے آپ کو اپنا بیانیہ لبرل بنانا پڑے گا اور نام نہاد وغیر جانبداری کا چولا پہننا پڑے گا۔ اس لیے آپ اگر اسلامی ہیں تو آپ جانبدار ہیں لیکن اگر آپ سیکولر و لبرل ہیں تو خوش آمدید۔ آپ غیر جانبدار اور کھلے ذہن کے مالک (Open Minded) گردانے جائیں گے۔ ہمارے مشاہدے میں کئی ایک ادارے، تھنک ٹینکس اور این جی اوز ہیں جو اگر آزاد فضا میں کام کر سکتیں تو ان کا اسلامی حوالہ نمایاں ہوتا لیکن چونکہ سیکولر اور لبرلز نے مقامی اور بین الاقوامی سطح پر فضا ایسی بنا

رکھی ہے کہ اسلام کا نام لے کر کام کرنا دشوار ہے اس لیے ملفوف رہ کر ہی کام کیا جا سکتا ہے۔ جب ملفوف ہوں گے تو غیر محسوس طور پر سیکولرزم اور لبرلزم آپ کے اعضا و جوارح میں سرایت کر جائیں گے۔

تیسرا عنصر جو سیکولرزم لبرلزم کو پاکستانی معاشرے میں پروموٹ کرتا ہے وہ بین الاقوامی عنصر ہے۔ اقوام متحدہ نے تقریباً عالمی حکومت کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اقوام متحدہ کے کنونشنز اور چارٹرز جن کا پاکستان دستخط کنندہ ہے، اپنا اثر ونفوذ دکھاتے ہیں۔ اب جن کنونشنز اور جن چارٹرز پر آپ نے دستخط کر دیے ہیں انہیں الفاظ و معانی کی سپرٹ کے ساتھ ملک میں نافذ کرنا ہوتا ہے۔ یہ سارے کنونشنز، چارٹرز اور معاہدے سیکولر فکر کے حامل ہوتے ہیں لہٰذا ان کی وجہ سے از خود سیکولر و لبرل ماحول پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بالا دست ممالک ہیں اور بین الاقوامی مالیاتی ادارے ہیں جو امداد کے ساتھ اپنی شرائط منواتے ہیں بلکہ اپنے ہاں نام نہاد قانون سازی کر کے اور بین الاقوامی کنٹرول کے لیے ادارہ سازی کر کے پاکستان جیسے کمزور ملکوں کے بازو مروڑ کر اپنی بات منواتے ہیں۔ پاکستان میں متعدد این جی اوز کام کر رہی ہیں جو امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، جاپان، سویڈن، ناروے، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ سے فنڈنگ لیتی ہیں اور ملک میں سیکولرزم و لبرلزم کے فروغ کے لیے اور اسلامیت کو دبانے کے لیے کام کرتی ہیں۔ یہ این جی اوز یہاں سے معلومات اکٹھی کر کے اپنے آقایان ولی نعمت کو دیتی ہیں اور ان کی طرف سے پاکستانی حکومت اور پاکستانی اداروں پر دباؤ ڈلوانے کا اہتمام کرتی ہیں۔ حدود آرڈیننس، توہین رسالت کے قانون، نصاب میں اسلامی مواد، اقلیتوں کے حقوق، حقوق نسواں کی تحریک، 'میرا جسم میری مرضی' اور اسی طرح کے دوسرے معاملات میں چند افراد پر مشتمل شور وغوغا کی پشت پر مغربی ملکوں اور امریکہ کی فنڈنگ کارفرما ہوتی ہے۔ پاکستانی معاشرے کے سیکولر لبرل کردار کے فروغ میں یہ تیسرا عنصر بہت قوت کے ساتھ کام کر رہا ہے اور بدقسمتی یہ ہے کہ بعض اسلامسٹ حلقے بھی دانستہ یا نادانستہ ان قوتوں کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔ اسلامسٹوں کا آلہ کار بننا بنیادی طور پر فہم وشعور کی کمی کی وجہ سے ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ بعض متدین حلقوں اور ٹھیٹھ اسلامی شخصیات کا اسلامی راڈار اتنا کمزور اور آلودہ ہو چکا ہے کہ دشمن کے بالکل سامنے سے ہونے والے نظریاتی حملوں کا بھی ادراک نہیں کر پاتا اور توڑ

کرنے کی بجائے معاونت اور مفاہمت پر آمادہ ہوجاتا ہے۔سب سے کھلی حالیہ مثال تحریک انصاف کی حکومت کا سنگل نیشنل کریکولم ہے جس میں اسلامیات کا مضمون بھی ہے اور لازمی تدریس القرآن بھی ہے۔ تدریس القرآن ناظرہ تو ۱۹۶۰ سے سکولوں میں لازمی ہے اور اسلامیات کا نصاب وہی ہے جو پچھلے ۲۰، ۲۵ سالوں سے سکولوں میں نافذ ہے لیکن جو دیگر مضامین کا نیا نصاب لایا جارہا ہے وہ مکمل سیکولر اور ہیومنزم کے بے خدا فلسفہ حیات کی اقدار کا ملغوبہ ہے اور ہمارے علمائے کرام اسی بات پر خوش ہیں کہ اسلامیات پڑھائی جائے گی اور تدریس القرآن لازمی ہوگی۔

پس چہ باید کرد

۱۔ وسیع پیمانے پر تحریر وتقریر کے ذریعے عوام اور بالخصوص خواص کا فہم وشعور درست کرنے کی سعی کی جائے اور سیکولرزم ولبرلزم کے خفیہ ہتھیاروں اور ان کی دور مار صلاحیت کو اجاگر کیا جائے۔

۲۔ سکول کی تعلیم کی اصلاح کے لیے کام کیا جائے۔ ماڈل تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں اور قوم کو صحیح تعلیم کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

۳۔ ایک منصوبے کے تحت اعلیٰ تعلیم میں درسی مواد کی فراہمی، تحقیقی موضوعات کے لیے رہنمائی اور فیکلٹی ڈویلپمنٹ کے لیے کام کیا جائے۔

۴۔ ایک ادارہ بلکہ کئی ادارے قائم کیے جائیں جن میں دینی مدارس کے فاضلین کو انگریزی، ابتدائی سائنس، ابتدائی معاشیات وغیرہ پڑھائی جائے اور یونیورسٹیوں کے فاضلین کو عربی، قرآن اور حدیث کے کورسز کرائے جائیں۔ دونوں گروپوں پر یہ کام ایک سال تک کرنے کے بعد انہیں ریسرچ پراجیکٹس دے کر ایم فل، پی ایچ ڈی کی ڈگریوں کے لیے تیار کیا جائے۔ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم کے لیے سوشل سائنسز میں درسی مواد تیار کرنے کا کوئی راستہ نکالا جائے۔

۵۔ صرف علم اور تحقیق کی بنیاد پر ہی سیکولرزم ولبرلزم کا توڑ اور مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔

پاکستانی معاشرت ادارہ

ابا جی، ڈیڈی اور پاپا میں فرق

جب میں نے ہوش سنبھالا اس وقت تمام گھروں میں والد کو ابا جی کہا جاتا تھا۔ اُس دور میں ابا جی صرف بچوں کے لیے ہی نہیں بلکہ بچوں کی ماں کے لیے بھی خوف کی علامت ہوا کرتے تھے، ادھر ابا جی گھر پہنچتے اور اُدھر گھر کے صحن پر سناٹا چھا جاتا، بچے گھر کے کونوں کھدروں میں دبک جاتے اور بچوں کی اماں سر پر دوپٹہ اوڑھ لیتی۔

ابا جی کے ہاتھ سے تھیلا وغیرہ پکڑ کر مقررہ جگہ پر رکھ دیا جاتا اور ابا جی چار پائی پر بیٹھ کر جُوتے اُتارتے جنہیں فوراً ایک طرف اُٹھا کر رکھا جاتا۔ پھر ابا جی کوئی بھی حکم جاری کرتے تو فوراً اُس کی تعمیل ہوتی، پھر ابا جی کو کھانا پیش کیا جاتا اور امی جان اُنہیں قریب بیٹھ کر کھانا کھلاتیں اور سب بہن بھائی بھاگ بھاگ کر اُنہیں کبھی نمک اور کبھی چٹنی مہیا کیا کرتے تھے۔

ابا جی کے غسل سے پہلے امی جان غسل خانے کا معائنہ کرتیں اور وہاں ڈبہ تولیہ صابن وغیرہ ہر چیز رکھ دیتیں اور پھر ابا جی کے کپڑے استری ہوتے۔ ابا جی جب دفتر جاتے تو امی اُن کو دروازے تک رخصت کرنے جاتیں اور ابا جی کے روانہ ہوتے ہی گھر میں چھائی خاموشی کے بند ٹوٹتے اور بچوں کی شرارتیں اور امی جان کی دھمکیاں شروع ہو جاتیں کہ شام کو تمہارے ابا آئیں گے تو تمہاری شکایت لگاؤں گی۔ اُس دور میں ابا جی کی دہشت ہر وقت بچوں پر چھائی رہتی تھی، مُجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سکول کی پراگریس رپورٹ پر ابا جی سے دستخط کروانا ایک مشکل ترین مرحلہ ہوتا تھا۔

پھر زمانہ بدلا تو بچے ابا جی کو ڈیڈی اور ماں جی کو ممی کہنے لگے۔ ڈیڈی کہلوانے والوں کا وہ رعب اور دہشت نہیں ہوتی تھی جو ابا جی کہلوانے والوں کی ہوتی تھی۔ ڈیڈی وہ حضرات تھے جو عورت اور مرد کی برابری پر یقین رکھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ بیوی اور بچوں کو ڈرا کر رکھنے کی بجائے ان سے دوستانہ تعلقات ہونے چاہئیں، چنانچہ ڈیڈی حضرات حکمِ آخر جاری کرنے کی بجائے مشاورت پر یقین رکھتے تھے اور گھروں میں ان کا طرز عمل ابا صاحبان سے کافی بہتر

ہوتا تھا جو مخاطب کی پُوری بات سُنے بغیر ہی جوتا اُتار لیا کرتے تھے۔

ڈیڈی کہلوانے والے صاحبان کو اگر کھانے میں کوئی نقص نظر آتا تو وہ انتہائی شائستگی سے اُس کی نشاندہی کرتے اور ابا صاحبان کی طرح کھانا صحن میں اُٹھا کر نہیں پھینکتے تھے۔ ڈیڈی کہلوانے والے بچوں کے سوالات کے جوابات انتہائی پیار ومحبت سے دیتے اور بیوی کی طرف سے اٹھائے گئے سوالات ومطالبات کے جوابات بھی خندہ پیشانی اور دلبری سے دیتے اور گھروں میں توازن کی فضا برقرار رکھتے تھے۔

زمانہ اور اور آگے بڑھا اور ابا صاحبان کو پاپا اور والدہ کو ماما کہا جانے لگا۔ یہاں سے گھروں میں ایک بڑی تبدیلی آنی شروع ہُوئی اور گھر میں حکمرانی کا تاج پاپا کی بجائے ماما کے سر پر سجایا جانے لگا اور پاپا کی حیثیت گھر میں ایک عام شہری جیسی ہوگئی۔ پاپا صاحبان جب دفتر سے گھر واپس آتے ہیں تو اُن کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا، ماما ٹی وی دیکھتی رہتی ہیں اور بچے موبائل فون پر ایس ایم ایس کرتے رہتے ہیں، پاپا حضرات کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے کھانا مانگتے ہیں تو ماما کہتی ہیں ذرا صبر کریں ڈرامے میں وقفہ آتا ہے تو کھانا دے دیتی ہُوں۔ اگر پاپا موصوف زیادہ بھوک لگی ہونے کی شکایت کرتے ہیں تو ماما کہتی ہیں کہ دفتر سے نکلتے ہی فون کر دیا کریں، مَیں کھانا گیٹ پر ہی رکھ دیا کروں گی۔

اس جواب کے بعد پاپا دبک کر بیٹھ جاتے ہیں اور ڈرامے میں وقفے کا انتظار کرتے ہیں۔ خُدا خُدا کر کے ڈرامے میں کمرشل بریک آتا ہے تو ماما بھاگ کر کچن میں جاتی ہیں اور کھانا لا کر شوہر کے سامنے یُوں رکھتی ہیں جیسے وہ پیش نہ کیا جا رہا ہو بلکہ اُسے ڈالا جا رہا ہو اور شوہر کے ہاتھ سے ٹی وی کا ریموٹ جسے شوہر نے بیوی کی غیر موجودگی میں اُٹھا لیا ہوتا ہے، واپس جھپٹ لیتی ہیں اور کہتی ہیں ابھی تو بڑا بھوک بھوک کا شور مچایا ہوا تھا اور اب خبریں سُننے کی پڑ گئی ہے چُپ کر کے کھانا کھاؤ اور اگر پاپا کھانے کے بعد ٹی وی کا ریموٹ دوبارہ مانگتے ہیں تو ماما کہتی ہیں کہ چُپ کر کے جا کر سو جائیں اور یُوں پاپا حضرات دُم دبا کر سونے چلے جاتے ہیں۔

آج کل کے پاپا کی حیثیت اے ٹی ایم مشین سے زیادہ نہیں رہ گئی اور میں یہ سوچتا ہوں کہ کہاں وہ کل کے ابا جان اور کہاں آج کے پاپا، زمانہ کیا سے کیا ہوگیا؟

اسلام اور پاکستان محمد عاصم حفیظ

'مجرا ہماری معاشرتی روایات کا حصہ ہے' لبرلز کا دعویٰ

مجرے کے شیدائی لبرلز مجرے کا اشتہار رکنے پر آگ بگولا

نامور صحافی محترم انصار عباسی نے پیمرا کی توجہ ایک بسکٹ کے گھٹیا اور بیہودہ اشتہار کی جانب دلائی جس میں باقاعدہ مجرا پیش کر کے بسکٹ کی تشہیر کی گئی ۔ پیمرا نے ایکشن لیتے ہوئے اس کو روکا تو فواد چوہدری، ارشد شریف اور غریدہ فاروقی سمیت کئی لبرلز آگ بگولا ہو گئے اور سوشل میڈیا پر پیمرا کو تنقید کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ کہا گیا کہ مجرا تو ہماری معاشرتی روایات میں شامل ہے ۔انہوں نے مجرے کے اشتہار کو روکنے کو شدت پسندی قرار دیا اور عورتوں کو ناچنے کا حق دینے کا مطالبہ کیا۔

پیمرا کے ایکشن نے لبرل حلقوں میں کہرام برپا کر دیا ہے۔ وہ واضح طور پر مجرے کی حمایت اور ناچ گانے کی محبت میں باؤلے ہوئے جا رہے ہیں۔ پیمرا نے ایکشن اشتہارات کے حوالے سے ملکی قوانین کے تحت لیا ہے۔

جب ڈراموں میں فحش سین ہوتے ہیں اور گھٹیا اشتہارات چلتے ہیں تو کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی ۔ اگر غلطی سے پیمرا کسی بیہودہ اشتہار پر جاگا ہی ہے تو ان لبرلز کی دم پر پاؤں آ چکا ہے اور وہ مجرے کو معاشرتی روایت قرار دے رہے ہیں۔ اس سے آپ عورت مارچ کرتے اور حقوق کا ڈھنڈورا پیٹتے لبرلز کی سوچ کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو عورت کو مجرے کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ مجرا معاشرتی روایات کا حصہ نہیں بلکہ ناپسندیدہ ہے جسے کوئی بھی مہذب مسلمان شہری پسند نہیں کرتا۔

تفہیم مغرب ڈاکٹر سید حسین نصر

جدید ٹیکنالوجی کے تباہ کن اثرات

میں آخری شخص ہوں گا جو جدید ٹکنالوجی کو غیر جانب دار یا انسانیت کا خیر خواہ خیال کرے۔ مسئلے کو بہ حیثیت مجموعی دیکھنا ہوگا۔ جدید ٹکنالوجی کا ایک ابلیسی پہلو بھی ہے جو ابن آدم کے ظاہر و باطن دونوں کی روحانی کیفیت کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس بات میں ذرا شک کی گنجائش نہیں ہے۔ مَیں آج کی گفتگو میں اس بات کو واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ جب مَیں ’احتیاط‘ کی بات کرتا ہوں تو اس سے میری مراد یہ ہوتی ہے کہ مسلم دنیا کو جدید ٹکنالوجی کی اندھی تقلید نہیں کرنی چاہیے بلکہ جدید ٹکنالوجی پر ویسی ہی کڑی تنقیدی نگاہ رکھنے کی قابلیت پیدا کرنی چاہیے جیسی انگلستان میں ولیم میور، جان رسکن اور مغرب کے بہت سے دانشوروں نے بیسویں صدی میں اختیار کی تھی۔ افسوس! ہماری مسلم دنیا میں دانشوروں کی بہت کمی ہے۔ ہمیں ان کی سخت ضرورت ہے۔ ہمیں جدید ٹکنالوجی میں مضمر تمام خطرات سے باخبر ہونا چاہیے اور اس کی ہر بات کو بے چوں و چرا قبول نہیں کر لینا چاہیے۔ آپ نے سیل فون کی بہت اچھی مثال دی۔ سیل فون نے واقعی لاکھوں انسانوں کے ماحول کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ سیل فون نے ہماری اُس اندرونی پرسکون دنیا کو بھی تباہ کر دیا ہے جس میں ہم خدا کے ساتھ تنہا ہوتے ہیں۔ اس چھوٹے سے آلے نے ہر شخص کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ ہمہ وقت دنیا کے آفات و آلام سے پُر ہنگاموں سے اپنی زندگی کا رشتہ جوڑے رکھے۔ اور یہ کوئی اتفاقی امر نہیں ہے۔ اگر سوچا جائے تو جہاں تک روحِ انسانی پر اس کے اثرات کا تعلق ہے، اس میں بڑی گہری معنویت ہے۔

آیئے اب مسئلے پر ایک اور جہت سے بات کرتے ہیں۔ فرض کرو ایک فائر سٹیشن یا کسی سرکاری ایجنسی کو اپنے عملے اور متعلقہ حضرات سے فوری رابطے کی ضرورت ہے اور اُن سے کہا جائے کہ وہ اپنے پاس سیل فون نہ رکھا کریں کیونکہ اس سے رُوح کمزور پڑتی ہے تو وہ آپ کی بات سنیں گے بھی نہیں۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ عملی سطح پر کوئی مسلم حکومت اس حل کو قبول نہیں

کرے گی۔ ہم فکری سطح پر جو کچھ کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک تنقیدی کسوٹی فراہم کردیں اور نشان دہی کردیں کہ کہاں کہاں احتیاط کی ضرورت ہے اور ذرا گہرائی میں جا کر جدید سائنس و ٹکنالوجی کے اس پورے کارخانے کی تار و پود، اس کے مجموعی مزاج اور ماحول کے بارے میں بھی بتائیں کہ اس کا ایک ایک جز ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہے کہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ حصہ تو بہت اچھا اور کارآمد ہے اور باقی حصے برے اور بیکار ہیں۔ یقیناً صورتِ حال اس سے مختلف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید ٹکنالوجی اپنے ساتھ ایک خاص تصور کائنات، ایک خاص طرزِ زیست، ایک خاص طرزِ عمل اور ایک خاص تصورِ وقت بھی لاتی ہے۔ جدید ٹکنالوجی کے ساختہ وقت بچانے والے تمام آلات دراصل وقت کو برباد کرنے والے ہیں۔ ای میل وقت بچاتی ہے لیکن اس کی وصولی اور جواب کی ترسیل آپ کے ذہن وجسم پر دباؤ ڈالتی ہے۔ یہ ناقابل تردید حقیقت ہے۔ میں سوچ نہیں سکتا کہ اسلامی تہذیب مغربی ٹکنالوجی کا ایک اچھا حصہ اختیار کرے اور کہے کہ یہ اچھا اور کارآمد ہے اور دوسرا حصہ مسترد کرے اور کہے کہ یہ بُرا اور بے کار ہے۔ آپ جدید ٹکنالوجی کا جو بھی حصہ اختیار کریں وہ لازماً اپنے ساتھ منفی اثرات بھی لائے گا۔ بہرحال عملی سطح پر مجھے نہیں معلوم کہ تاریخ کے جاریہ حالات میں ٹکنالوجی کی کون کون سی صورتیں ترک کی جاسکتی ہیں لیکن اتنا وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم احتیاط اور تنقیدی رویہ اختیار کریں تو حالات بدل سکتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ مغربی ٹکنالوجی کے بعض پہلو مسلم حکومتیں اختیار کر رہی ہیں۔ خواہ آپ کچھ بھی کہیں اور مَیں کچھ بھی کہوں۔ کاش ایسا نہ ہوتا لیکن ہو رہا ہے اور روکا نہیں جاسکتا۔ اگر روکا نہیں جاسکتا تو جدید ٹکنالوجی پر کم ازکم ایک تنقیدی کسوٹی تو بٹھائی جاسکتی ہے اور جہاں تک ممکن ہو اس کے منفی اثرات کو کم کیا جاسکتا ہے۔ کاش ہم مغربی ٹکنالوجی کو الگ رکھ کر اپنی اسلامی ٹکنالوجی کو ترقی دے سکتے جیسی ازمنۂ وسطیٰ میں ہوئی تھی۔ اگر فی الوقت ایسا ممکن نہیں ہے تو کم ازکم اتنا تو کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کا ذہنی رویہ تبدیل کیا جائے اور اُنھیں آگاہ کیا جائے کہ مشینوں کی حکومت سے کیسے کیسے منفی اثرات وارد ہوتے ہیں۔ جدید اداروں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ

مسلمانوں اور بالخصوص برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں میں سائنس پرستی کا رجحان مذہبی عقیدے کی سی پختگی کے ساتھ پایا جاتا ہے جسے دور کرنا بہت مشکل ہے۔

ہم میں اتنی جرأت تو ہونی ہی چاہیے کہ جدید سائنس کی خامیوں کی نشان دہی کر سکیں اور سائنس کی تفہیم کے لیے ایک دوسرا عقلی وروحانی فریم ورک دے سکیں۔ اس کے بعد اگلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنی اسلامی سائنس کو ترقی دیں اور رائج کریں۔ یہ وہ بات ہے جو میں چالیس سال سے کہتا آرہا ہوں۔ گویا پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنی اسلامی عقلی روایت کی جڑوں سے پیوستہ رہتے ہوئے جدید سائنس پر مکمل دسترس حاصل کریں۔ پھر اگلا قدم اسلامی فریم ورک کے اندر رکھیں، جدید سائنس کے فریم ورک کے اندر نہ رکھیں۔ کوئی مسلمان طبیعیات دان یہ ہرگز نہیں کہے گا کہ وہ کوانٹم میکانیات کی دریافتوں کی پروا نہیں کرتا۔ یہ فضول بات ہے۔ ضرورت جس بات کی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے کوانٹم میکانیات کو سمجھا جائے۔ پھر اس کی تشریح اس طریق سے کی جائے جس طریق سے کوپن ہیگن سکول نے کی تھی۔ یعنی ڈیکارٹ کے فلسفۂ ثنویت کے اُصول پر جس کی بنیاد پر جدید سائنس کا سارا کارخانہ کھڑا کیا گیا ہے۔ اگر ہم ایسا عقلی سطح پر کر سکیں اور عالم خارجی کا مستند اسلامی فلسفہ یا مابعد الطبیعیات تخلیق کر سکیں اور دوسرے یہ کہ ہم اپنی سائنسی روایت اور مغربی سائنس دونوں کے امتزاج سے عالم خارجی کی اسلامی سائنس وضع کر سکیں اور تیسرے یہ کہ مغربی سائنس کو ہم اپنی سائنسی روایت میں جذب کر سکیں تو پھر ایسی سائنس کی بنیاد پر ہمارے لیے اپنی ٹکنالوجی پیدا کرنا ممکن ہو سکے گا۔ لیکن فی زمانہ دنیا کی معاشی، عسکری اور سیاسی طاقتیں اس قدر مضبوط و مستحکم ہیں کہ اگر آپ یہ کہیں کہ ''ہم جدید سائنس وٹکنالوجی کو مسترد کرتے ہیں'' تو کوئی آپ کی بات نہیں سُنے گا۔ آپ ذرا موجودہ عالمِ اسلام پر نظر دوڑائیے۔ مسلم حکومتیں مغرب نواز ہوں یا بادشاہتیں یا جمہوریتیں ہوں، اسلامی انقلاب کی پیداوار ہوں یا سیکولر ہوں، وہ سب جدید سائنس وٹکنالوجی کی شان میں قصیدہ خوانی میں متحد ومتفق ہیں۔ مسلم حکومتوں کا یہ وہ رویہ ہے جسے تبدیل ہو جانا چاہیے۔

خدا کا شکر ہے کہ گزشتہ تیس چالیس برسوں میں کچھ تبدیلی آئی ہے۔ پہلے کی نسبت کافی بہتری نظر آتی ہے جس میں اس ناچیز کی عاجزانہ کوششوں کا بھی حصہ ہے۔ اب کم از کم اتنا تو ہوا

ہے کہ چند آوازیں اُٹھی ہیں جو کہتے ہیں کہ جس راستے پر ہم جارہے ہیں وہ صحیح نہیں ہے۔ نیز یہ کہ عقلی روایت کو جدید سائنس وٹکنالوجی پر تنقید کرنے کے قابل ہونا پڑے گا۔ اگر اس دریا پر ایک کمزور پل تعمیر کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو تو ہمیں کم از کم یہ نہیں کہنا چاہیے کہ واہ جدید سائنس کی کیا بات ہے! یہ کیسی شاندار چیز ہے! ہمیں اپنا یہ رویہ بدلنا پڑے گا۔ اگر جدید طب کو اپنانے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو تو ہمیں کم از کم اس کی خامیوں کا احساس ہونا چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی روایتی اسلامی طب کی ترقی وترویج کی کوشش بھی کرنی چاہیے جسے فراموش کردیا گیا ہے۔ اور اب کہ جب چینی آکوپنکچر مغرب میں آرہا ہے تو خوشی کی بات ہے کہ اکثر لوگ طب اسلامی کی تجدید کی باتیں کرتے ہیں۔ مَیں کہتا ہوں ہمیں اپنی ذہنیت کو بدلنا ہوگا اور دراصل سارے قصے میں سب سے اہم کام کی بات یہی ہے۔

مجھے محمد علی پاشا اور ایسے دوسرے حضرات سے سخت اختلاف ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یورپ جاؤ، وہاں بندوقیں بنانا سیکھو اور واپس آؤ۔ بندوق بردار فوجیں کھڑی کرو اور باقی ہر چیز بھول جاؤ۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ہم ایسا نہیں کرسکتے۔ دراصل تمام چیزیں اکٹھی آتی ہیں۔ بندوق سازی سے لے کر کمپیوٹر اور سیل فون بنانے کی ٹکنالوجی تک، فولاد سازی، جہاز سازی یہ سب صنعتیں آتی ہیں کیونکہ ان سب کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ ٹکنالوجی اپنا ایک تصورِ کائنات رکھتی ہے اور انسان پر عائد کرتی ہے۔ یہ انسان کو بھی ایک مشین بنادیتی ہے۔ اسلامی تہذیب کو ہر ممکن طریقے سے کوشش کرنی چاہیے کہ وہ انسان کو مشین نہ بننے دے اور جب مَیں یہ کہتا ہوں کہ ہماری حکومتوں کے پاس فی الوقت ٹکنالوجی درآمد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ صورتِ حال ہمیشہ قائم رہے گی اور ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار آئندہ بھی نہ ہوگا۔ میری تجویز یہ ہے کہ فی الحال ہم تاخیری حربے اختیار کرسکتے ہیں۔ یعنی مغربی سائنس وٹکنالوجی کی اندھا دھند تقلید کرنے کی بجائے ہمیں یہ کرنا چاہیے کہ جہاں تقلید انتہائی ضروری ہو وہاں کی جائے اور جہاں ضروری نہ ہو وہاں نہ کی جائے۔ دریں اثنا اس مہلت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہم اپنی سائنس کی تخلیق کے لیے وقت نکال لیں اور یوں انشاء اللہ ایک دن ہماری اپنی ٹکنالوجی بھی ہوگی۔ آپ دیکھیں گے۔

تفہیم مغرب

شاہنواز فاروقی

سیاسی، معاشی اور عسکری دہشت گردی و بدمعاشی کے باوجود مغرب 'مہذب' ہے

مغربی دنیا کو اگر عہدِ حاضر کا معاشی، سیاسی اور عسکری شیطان کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ مغربی دنیا کی معاشی شیطنت کا یہ عالم ہے کہ اس کی اطلاع عمران خان جیسے شخص کو بھی ہوگئی ہے۔ اقوام متحدہ کے پینل سے خطاب کرتے ہوئے عمران خان نے کہا کہ ترقی پزیر ممالک سے ہر سال ایک ہزار ارب ڈالر وائٹ کالر کرائمز کی صورت میں ترقی یافتہ ممالک کی جانب منتقل ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مغرب کے بینکوں میں ترقی پذیر ممالک کے 7 ہزار ارب ڈالر پڑے ہوئے ہیں۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ مغرب کی ملٹی نیشنل کمپنیاں ہر سال غریبوں ملکوں میں 600 ارب ڈالر کی ٹیکس چوری کرتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ دنیا کی معاشی عدم مساوات کا یہ عالم ہے کہ دنیا کی بیش تر دولت دنیا کے صرف 26 افراد کے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے کہا کہ ترقی پذیر ملکوں کو چاہیے کہ وہ مغرب میں پڑی ہوئی اپنی رقم کی واپسی کے لیے قوانین بنائیں۔ انہوں نے کہا کہ غربت عالمی امن کے لیے خطرہ ہے۔ (روزنامہ جنگ کراچی، 25 ستمبر 2020ء)

عمران خان کوئی ''انقلابی رہنما'' نہیں ہیں مگر مغرب کی معاشی لوٹ مار، اقتصادی شیطنت اور مالیاتی بدمعاشی نے انہیں بھی انقلابیوں کی طرح گفتگو پر مجبور کردیا ہے۔ عمران خان کہہ رہے ہیں کہ غریب ملکوں کے سیکڑوں نواز شریف اور زرداری ہر سال ایک ہزار ارب ڈالر امیر ملکوں میں منتقل کرتے ہیں۔ ایک ہزار ارب ڈالر ایک بہت بڑی رقم ہے۔ بھارت اور برطانیہ جیسے ملکوں کی مجموعی قومی پیداوار صرف 2 ہزار ارب ڈالر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ رقم اگر غریب ملکوں کے عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کی جائے تو اس سے غریب ملکوں کے بہت سے مسائل حل ہوسکتے ہیں مگر مغرب کے امیر ملک ایسا نہیں ہونے دیتے۔ وہ غریب ملکوں کے نواز شریفوں اور آصف زرداریوں کو لوٹ مار کرنے دیتے ہیں اور ان کی لوٹی ہوئی رقم کو اپنے بینکوں میں جمع ہونے دیتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ غریب ملکوں کے ''شریفوں اور

زرداریوں'' کو اپنے یہاں پناہ بھی دیتے ہیں۔ عمران خان کی اطلاع کے مطابق اس وقت مغرب کے بینکوں میں غریب ملکوں کے 7 ہزار ارب ڈالر پڑے ہوئے ہیں۔ یہ رقم اگر غریب ملکوں کو واپس مل جائے تو ان کے یہاں تعلیم عام ہوسکتی ہے، سب لوگوں کو سرکاری خرچ پر طبی سہولتیں میسر آسکتی ہیں مگر دنیا کے غریب ملکوں کی قیادتیں نہ اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کرتی ہیں نہ مغرب کی ''مہذب'' سیاسی قیادتیں اس سلسلے میں اپنی ''اخلاقی ذمے داری'' پوری کرتی ہیں۔

پاکستان میں حسن نثار اور جاوید چودھری جیسے لوگ آئے دن پاکستانیوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ ایمانداری سیکھنی ہو تو اہل مغرب سے سیکھو مگر اہل مغرب غریب اقوام کے ساتھ جو بے ایمانی کررہے ہیں اس پر حسن نثاروں اور جاوید چودھریوں کی نظر نہیں جاتی۔ عمران خان کے بیان کے مطابق مغرب کی ملٹی نیشنل کمپنیاں ہر سال 600 ارب روپے کے ٹیکس چوری کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی چوری کا مرکز بھی غریب اور ترقی پذیر اقوام ہیں۔ 600 ارب ڈالر بھی معمولی رقم نہیں۔ پاکستان کا پورا بجٹ پچاس ساٹھ ارب ڈالر کا ہوتا ہے۔ ہماری مجموعی قومی پیداوار تین سو ارب ڈالر کے لگ بھگ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر غریب ملکوں کو ہر سال 600 ارب ڈالر کی آمدنی ہو جایا کرے تو ان کے کئی معاشی مسائل دور ہوسکتے ہیں مگر مغرب کی ملٹی نیشنل کمپنیاں اس کی نوبت نہیں آنے دیتیں۔

حسن نثار کئی بار اپنے کالم اور اپنی گفتگو میں یہ فرما چکے ہیں کہ جب برطانیہ میں آکسفورڈ یونیورسٹی تعمیر ہو رہی تھی تو برصغیر میں مسلم حکمران تاج محل بنا رہے تھے اور برصغیر کے مسلمان نکبت و ادبار میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مگر برطانیہ کے ممتاز مورخ ولیم ڈیل ریمپل نے اپنی معرکہ آراء تصنیف ''The Anarchy'' میں لکھا ہے کہ انگریز برصغیر میں آئے تو مسلم برصغیر معاشی اعتبار سے اتنا طاقت ور تھا کہ وہ عالمی پیداوار کا 25 فی صد پیدا کر رہا تھا۔ مغرب کے ممتاز دانشور مائیکل مورگن ہملٹن نے اپنی یادگار تصنیف Lost History میں مسلم برصغیر کو سائنس کے اہم مراکز میں شمار کیا ہے۔ جہاں تک تاج محل کا تعلق ہے تو اس کا وجود اس بات کی علامت ہے کہ مسلمان انجینئرنگ کے شعبے میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے اور ان کا ''تصورِ جمال'' اعلیٰ ترین تھا۔ اس کی شہادت امریکا کے عظیم شاعر اور نقاد ایزرا پاونڈ نے بھی دی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ تاج محل جیسا شاہکار وہی قوم تخلیق کرسکتی تھی جو سود خور نہ ہو۔ یعنی سود خور

قوموں کا تصورِ جمال اتنا اعلیٰ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ تاج محل تخلیق کر سکیں۔ مگر یہ باتیں مغرب زدہ حسن نثاروں اور جاوید چودھریوں کی سمجھ میں نہیں آسکتیں۔

یہاں ہمیں بھارت کی ممتاز محقق اُتسا پٹنائک کی تحقیق یاد آ گئی۔ اُتسا کی تحقیق یہ ہے کہ ’’مہذب انگریز‘‘ برصغیر سے 45 ہزار ارب ڈالر لوٹ کر لے گئے۔ امریکا اور چین دنیا کی دو بڑی معاشی طاقتیں ہیں ان کی مجموعی قومی پیداوار آج بھی 45 ہزار ارب ڈالر سے کم ہے۔ برطانیہ اور بھارت کی مجموعی قومی پیداوار کو دیکھا جائے تو ان کی گیارہ سال کی مجموعی قومی پیداوار 45 ہزار ارب ڈالر بنتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انگریز جس مسلم برصغیر میں آئے وہ واقعتاً ’’سونے کی چڑیا‘‘ تھی مگر انگریزوں کی لوٹ مار نے اسے ’’مٹی کا پیالہ‘‘ بنا دیا۔ اس کے باوجود بھی انگریز ’’مہذب‘‘ بھی ہیں، ’’تعلیم یافتہ‘‘ بھی، ’’باشعور‘‘ بھی ہیں اور ’’انسان دوست‘‘ بھی، ’’قانون کے پابند‘‘ بھی ہیں اور ’’ضابطوں کے اسیر‘‘ بھی۔

مغربی اقوام کی ’’سیاسی شیطنت‘‘ بھی بے مثال ہے۔ مغرب چاہتا ہے تو مسلم دنیا میں مارشل لا لگتا ہے۔ مغرب چاہتا ہے تو مسلم دنیا میں جمہوریت بحال ہوتی ہے۔ مغرب چاہتا ہے تو جمہوری حکومتیں چلتی ہیں۔ مغرب نہیں چاہتا تو اربکان، حماس اور مرسی کی جمہوری حکومتیں منہ کے بل گر جاتی ہیں۔ مغرب کا اصرار ہے کہ بادشاہتوں کا زمانہ ختم ہو چکا، مگر مشرق وسطیٰ کے مسلم ملکوں میں بادشاہتیں اپنی بہاریں دکھا رہی ہیں اور مغرب ان بادشاہوں کی پشت پر کھڑا ہے۔ بلکہ ڈونلڈ ٹرمپ نے تو خود اعتراف کیا ہے کہ سعودی عرب کی بادشاہت امریکا کے دم قدم سے قائم ہے۔ امریکا اس کی پشت پناہی نہ کرے تو ٹرمپ کے بقول سعودی عرب کی بادشاہت دو ہفتوں میں مسمار ہو جائے۔

مغرب آزادی کی بات کرتا ہے مگر اسے مسلم دنیا میں کہیں بھی آزاد سیاسی رہنما درکار نہیں۔ مغرب کو مسلم دنیا میں دوستوں کی نہیں ’’ایجنٹوں‘‘ اور ’’غلاموں‘‘ کی ضرورت ہے۔ مغرب کا ایجنٹ بادشاہ ہو یا فوجی آمر یا جمہوری رہنما مغرب کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مغرب کو ایجنٹ ہر لباس میں قبول ہیں۔

اقوام متحدہ مغرب کی سیاسی شیطنت کی ایک بہت عمدہ مثال ہے۔ اقوام متحدہ عالمی تنازعات کو حل کرنے کے لیے بنائی گئی ہے مگر وہ آج تک کوئی بھی بڑا عالمی تنازعہ حل نہیں

کرسکی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اقوام متحدہ جمہوری ادارہ نہیں ہے۔اقوام متحدہ ایک آمرانہ ادارہ ہے،اس کا ثبوت یہ ہے کہ اقوام متحدہ دواداروں میں منقسم ہے۔اقوام متحدہ کا ایک ادارہ جنرل اسمبلی ہے، یہ تقریروں کا ادارہ ہے، عالمی رہنما آتے ہیں اور ہر سال جنرل اسمبلی میں تقریر کرکے چلے جاتے ہیں۔اقوام متحدہ کا اصل ادارہ سلامتی کونسل ہے جہاں پانچ عالمی غنڈوں کو ویٹو پاور حاصل ہے۔ویٹو پاور، عقل، دلیل، جمہوریت ہر چیز کی نفی ہے۔مگر سلامتی کونسل 75 سال سے ویٹو پاور کے ساتھ کام کررہی ہے۔ویٹو پاور پر نہ امریکا کو اعتراض ہے، نہ فرانس اور برطانیہ کو، نہ مغرب کے کسی اور ملک کو۔اس لیے کہ ویٹو پاور مغرب کی بالادستی کی علامت ہے۔اس سے عقل اور دلیل کی مٹی خراب ہوتی ہے تو ہوا کرے۔اس سے جمہوریت کی عصمت تار تار ہوتی ہے تو بیشک ہو۔

مثل مشہور ہے بدا چھا بدنام برا۔چنگیز بد بھی تھا اور بدنام بھی۔مگر مغرب کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چنگیز خان سے لاکھوں گنا بد ہے مگر مغرب بدنام نہیں ہے۔مغرب کے معروف دانش ور مائیکل مان نے اپنی تصنیف '*Dark Side of the Democracy*' میں لکھا ہے کہ مغرب کے سفید فام لوگوں نے امریکا پر قبضہ کرنے کے لیے ''Americas'' میں 8 سے 10 کروڑ لوگوں کو مار دیا۔چنگیز خان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک کروڑ سے زیادہ انسانوں کو مارا۔مگر ایک کروڑ انسانوں کو قتل کرنے والا تو شیطان کہلاتا ہے مگر 10 کروڑ لوگوں کو قتل کرنے والے ''مہذب'' کہلاتے ہیں، ''صاحب شعور'' کہلاتے ہیں۔''آزادی کے پروانے'' اور ''انسان دوست'' کہلاتے ہیں۔چنگیز خان نے زندگی میں جو جنگیں لڑیں ان کی تعداد دوسو سے زیادہ نہیں۔لیکن مغرب کے ممتاز ماہر نفسیات ایرک فرام نے اپنی کتاب "*The Anatomy of Human Destructiveness* " میں اعداد و شمار سے ثابت کیا ہے کہ مغرب کی اقوام نے گزشتہ پانچ سو سال میں دو ہزار سے زیادہ جنگیں لڑی ہیں، مگر چنگیز خان ''لعنتی'' ہے البتہ مغرب کی اقوام ''مہذب'' ہیں۔ایرک فرام نے اس کتاب میں لکھا ہے کہ قدیم آدمی جسے مغرب وحشی کہتا ہے صرف اپنے دفاع میں دوسرے انسانوں کو مارتا تھا مگر ایرک فرام کے بقول مغربی انسان نے قتل کو کھیل بنا دیا ہے مگر قدیم آدمی ''وحشی'' ہے اور مغرب کا انسان ''مہذب''۔واہ صاحب واہ! جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

تبصرۂ کتب

ملک شفقت حیات [1]

آدابِ اختلاف (اتحادامت کا قابل عمل راستہ)

از ڈاکٹر اختر حسین عزمی

یہ دنیا درحقیقت عالم کثرت ہے اور تنوع سے عبارت ہے۔ تنوع کی بنیاد اختلاف ہے۔ اختلافِ رائے انسان کا ضروری وصف ہے اور انسانی ترقی کی مضبوط اساس ہے۔ انسانوں کی عقل وفہم کا دائرہ کبھی یکساں سطح پر نہیں رہا۔ اختلاف نقصان دہ چیز نہیں، مخالفت نقصان دہ ہے۔ آدابِ اختلاف کی رعایت رکھتے ہوئے دوسروں کے سامنے اپنا نقطۂ نظر رکھنا اور دوسرے کی بات کو برداشت کرنا ہی اس مسئلے کا حل ہے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر جناب پروفیسر ڈاکٹر اختر حسین عزمی نے ''آدابِ اختلاف: اتحادِ اُمت کا قابل عمل راستہ'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب تصنیف کی ہے، جو بڑے سائز کے ۴۹۸ صفحات پر مشتمل ہے اور جسے اسلامک پبلی کیشنز، ملتان روڈ، لاہور نے بڑے خوبصورت سرورق کے ساتھ شائع کیا ہے۔

کتاب پانچ ابواب اور ہر باب کئی فصول پر مشتمل ہے۔ باب اوّل فرقہ پرستی کے نقصانات کے بارے میں ہے۔ باب دوم آدابِ اختلاف پر روشنی ڈالتا ہے۔ باب سوم اختلاف ورواداری کو زیر بحث لاتا ہے۔ باب چہارم شیعہ سنی اختلافات کے بارے میں ہے جبکہ باب پنجم میں ان اختلافات کو دور کرنے کے بارے میں علاج اور تجاویز دی گئی ہیں۔

مصنف نے ہر باب اور فصل میں ضروری واقعات، مثالیں اور دلائل بیان کیے ہیں جن کی بنا پر مختلف مسالک کے درمیان اختلاف پیدا ہوتے ہیں اور ساتھ ہی بتایا ہے کہ کس طرح ہر دور میں اہل علم نے ان اختلافات سے بلند ہو کر اتحادِ امت کے لیے کوششیں کی ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ یہ کام اس سے پہلے ہمارے اسلاف واکابرین اپنے اپنے دور میں اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق سرانجام دیتے چلے آئے ہیں چنانچہ انہوں نے تو یہ کوشش کی ہے کہ اُنہی کے کام کو آگے بڑھایا جائے تاکہ اس بات کو علماء کے علاوہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ وتلامذہ اور نیم خواندہ واعظین وذاکرین کے سامنے ہلکے پھلکے انداز میں تاریخی حقائق اس انداز

[1] لاہور، 0333-4812245

میں پیش کیے جائیں کہ وہ ان اختلافات کی محققانہ اور علمی نوعیت جان سکیں کہ شاید اس طرح وہ اپنی سوچ کے زاویے کو تبدیل کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

پروفیسر صاحب نے کتاب کو زیادہ سے زیادہ قابل قبول بننے کے لیے تقریباً تمام مسالک کے جید علماء کی تقریظات کو کتاب کا حصہ بنایا ہے تاکہ اس سے ہر مکتبۂ فکر کے لوگ استفادہ کر سکیں۔ ان تمام اہل علم نے مصنف کے نیک جذبہ کو سراہا ہے اور ان کی اس کوشش کی تحسین کی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں میرے استفسار پر جناب ڈاکٹر انوار احمد بگوی مصنف تذکارِ بگویہ (۵ جلد) نے جو اس کتاب کو دیکھ چکے ہیں کہا کہ "کیا ہی اچھا ہو اگر اس اہم تصنیف کی تلخیص کر کے اس کو شائع کیا جائے تاکہ یہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔"

جناب ڈاکٹر پروفیسر اختر حسین عزمی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک اہم موضوع پر قلم اٹھایا اور امت میں فکری انتشار کے خاتمے کے لیے پورے جذبۂ صادق سے اپنا حصہ ڈالا۔ اللہ تعالیٰ ان کی صلاحیتوں میں مزید اضافہ فرمائے، آمین۔

بقیہ: دینی مدارس کے وفاقوں کے قائدین کی خدمت میں

۳۔ حکومت اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ کو ایک "بورڈ" اور ایک "یونیورسٹی" بنانے کی منظوری دے جس سے سارے دینی مدارس کا الحاق ہو۔

۴۔ حکومت یہ یقین دہانی کرائے کہ مالی تفصیلات مہیا کرنے کی صورت میں وہ مدارس کے عطیہ دہندگان کی حوصلہ شکنی نہیں کرے گی۔

۵۔ جب تک حکومت یہ مطالبات تسلیم نہ کرے، رجسٹریشن کے عمل کو مؤخر رکھا جائے۔

۷۔ ان مطالبات کی منظوری کے لیے حکومت کو وقت دیا جائے مثلاً دو ماہ کا اور اگر حکومت ان مطالبات کو نہ مانے تو سارے مدارس ایک مقررہ دن ہڑتال کریں اور ریلیاں نکالیں۔ پھر اس پرامن احتجاج کے اس سلسلے کو بڑھایا جائے جب تک حکومت دینی مدارس کے مطالبات تسلیم نہ کرے۔

نیز وکلاء سے مشورہ کر کے عدالتوں سے مدد لینے کا بھی سوچا جائے۔

تبصرۂ کتاب مدیر

'پاکستان کی دینی قوتیں ناکام کیوں؟' پر تبصرے

جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت کے احباب سے مکالمہ

'دینی قوتوں کی ناکامی پر' تبصروں کا سلسلہ جاری ہے۔ جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت کے بعض احباب سے بھی مکالمہ ہوا ہے۔ اس کی کچھ تفصیل:

پروفیسر ارشد جاوید (معروف ماہر نفسیات، لاہور)

میں نے ابھی آپ کی کتاب "پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟ پڑھی۔ یہ ایک شاندار کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کتاب کی روشنی میں مجھے بھی کچھ کرنے کی توفیق عطا فرمائیں اور آپ کو اجر عظیم سے نوازیں۔

میاں محمد رفیع (کھاریاں) [جماعت اسلامی]

میاں محمد رفیع صاحب انجینئر ہیں اور جماعت اسلامی کی فکر کے حامل ہیں۔ انہوں نے کتاب پڑھنے کے بعد خط اور فون کے ذریعے تین سوال اٹھائے۔

۱۔ اگر جدید دینی تحریکوں کی سیاسی جدوجہد کے مقابلے میں آپ اسلاف کے اس نقطۂ نظر کو زیادہ مفید اور مؤثر سمجھتے ہیں جنہوں نے غیر صالح مسلم حکمرانوں کو قوت سے بدلنے اور ان سے منافست کی بجائے دعوت وتزکیہ اور پر امن اصلاح کا طریقہ اختیار کیا تو پھر امت زوال کا شکار کیوں ہوئی؟

۲۔ جدید دینی تحریکوں (جیسے الاخوان المسلمون اور جماعت اسلامی) اور ان کے زعماء کے بارے میں آپ کی تنقید میں تندی کیوں پائی جاتی ہے؟

۳۔ آپ کی بعض باتوں میں وزن ہے لیکن ہم تو اپنی جماعت کے نظم کے پابند ہیں، آپ کی کسی بات پر عمل کیسے کر سکتے ہیں؟

ہم نے اس کے جو جوابات دیے وہ مختصر طور پر یہ ہیں:

۱۔ مغرب کے کفریہ نظام نیشنلزم اور ڈیموکریسی اور اسلام کے ملغوبے پر مبنی سیاسی نظام کے مقابلے میں ہم اسلاف کے غیر صالح مسلم حکمرانوں کی پرامن اصلاح کے فارمولے کو بلاشبہ اسلامی مقاصد کے لیے مفید تر اور بہتر سمجھتے ہیں۔ جہاں تک زوالِ امت کا تعلق ہے تو اس کے اسباب کئی ایک ہیں جن میں سے ایک سیاسی عدم استحکام بھی ہے تاہم ہماری رائے میں زوال کا بنیادی سبب ضعف ایمان اور اسوۂ نبوی کے مطابق تعمیر سیرت کا فقدان ہے جس کی بنیادی وجہ ''یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ'' کے نبوی منہج پر عمل نہ کرنا ہے۔

۲۔ آپ نے کہا ہے کہ جدید دینی تحریکوں اور ان کے زعماء پر میری تنقید تند و تیز ہوتی ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ عرض ہے کہ جس سے توقع زیادہ ہو، شکایت اور مایوسی بھی اُسی سے زیادہ ہوتی ہے۔ تاہم مَیں پوری شعوری کوشش کرتا ہوں کہ کسی پر میری تنقید تند و تیز نہ ہو۔ اگر آپ کا یہ احساس ہے کہ جدید دینی تحریکوں پر میری تحریر و تنقید میں شدت ہے تو میں ان شاء اللہ آئندہ مزید کوشش کروں گا کہ یہ نرم اور شائستہ ہو۔

۳۔ ہم نے کتاب میں جن پہلوؤں پر محنت کی طرف توجہ دلائی ہے، ان پر کام کرنے میں آپ کے لیے جماعتی نظم کی رکاوٹ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ مثلاً میری رائے ہے کہ تعلیم کا مقصد مسلمان بچوں کی دینی تعلیم و تربیت ہونا چاہیے اور تعلیمِ حکمت یعنی دنیوی شعبوں کی تعلیم بھی قرآن حکیم کے مطابق ہونی چاہیے، تو مولانا مودودی علیہ الرحمہ بھی تو اسی پر اصرار کرتے ہیں بلکہ وہ تو مغرب زدہ درس گاہوں کو باصرار قتل گاہیں کہتے ہیں۔ لہٰذا اگر آپ موجودہ نظام تعلیم کی اس نقطۂ نظر سے اصلاح کرنا چاہیں یا آپ ایسا تعلیمی ادارہ قائم کرنا چاہیں جو بچوں کو دنیوی تعلیم دینے کے ساتھ ان کی دینی تعلیم و تربیت کا بھی انتظام کرے یعنی آپ کے پیش نظر دعوت و اصلاح بھی ہو صرف پیسے کمانا اور مغربی فکر و تہذیب کی اقدار پر عمل اور ان کا فروغ ہی نہ ہو تو ہم نہیں سمجھتے کہ جماعت آپ کو ایسا کرنے سے روکے گی؟ یہی حال دعوت دین کا ہے کہ اگر آپ اس کے لیے تحریری یا تقریری کام کریں یا انفرادی ملاقاتوں کے ذریعے یہ کام کریں تو ہم نہیں سمجھتے کہ جماعت اس کی مخالفت کرے گی۔

تبلیغی جماعت میں بڑی تبدیلی

زندگی کے مختلف شعبوں کی اصلاح کے لیے'احیائے دین' کے عنوان سے جدوجہد

مولانا محمد سہیل (لاہور)

دینی مدارس اور جماعت اسلامی کے کام کا تجزیہ کرتے ہوئے ہم نے پچھلی ایک دہائی میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن ان کے کان پر کبھی جوں بھی نہیں رینگی۔ انہیں پرواہی نہیں کہ ان کے بارے میں کون کیا کہتا ہے، ان کی بلا سے۔ لیکن ہماری کتاب 'دینی قوتوں کی ناکامی کے اسباب' میں ہم نے تبلیغی جماعت کے منہج پر تنقید کرتے ہوئے جو کچھ لکھا اس پر تبلیغی جماعت کا ردِّعمل بڑا خوشگوار اور حیرت انگیز رہا۔ ان کے ایک فعال رکن شاہد منیر صاحب نے ہمارے محلے کے ایک تبلیغی کارکن کے ذریعے تعلیم پر ہمارا سارا لٹریچر خریدا اور اس شعبے کے ذمہ دار مولانا محمد سہیل صاحب تک پہنچایا۔ مولانا محمد سہیل صاحب نے ہماری کتابوں کی کچھ ورق گردانی کی اور پھر ان کے ساتھ تبادلۂ خیال کی ایک طویل نشست ہوئی۔

انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے احباب کے ساتھ مل کر پچھلے دس سال سے تبلیغی اکابر کی رضامندی سے زندگی کے مختلف شعبوں کی عملی اصلاح کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ان کا طریق کار یہ ہے کہ مثلاً تاجر پیشہ اصحاب کی ایک 'جماعت' بنائی گئی اور ان کو توجہ دلائی گئی کہ تجارت اسلامی اصولوں کے مطابق کی جائے۔ انہوں نے اتفاق کیا تو ان میں سے کچھ پڑھے لکھے لوگوں پر ایک گروپ یا کمیٹی بنادی گئی جنہوں نے غور کر کے کچھ تحریری تجاویز تیار کر دیں۔ مرور وقت کے ساتھ اس تحریر میں حک واضافہ ہوتا گیا، بعض علماء کی مشاورت سے اسے بہتر بنالیا گیا۔ بعض جگہوں پر جماعت کے تاجروں کے حلقے میں اس کی تدریس بھی شروع ہوگئی۔ اس طرح عملی اصلاح بھی ہوتی گئی اور علمی مباحث وعملی تجربات پر مشتمل ایک مبسوط تحریر یا سلیبس بھی تیار ہوگیا۔

یہی کام مولانا سہیل صاحب کی زیر نگرانی ملازمت پیشہ حضرات نے مل کر کیا، ڈاکٹروں اور اطباء نے مل کر کیا، زراعت کے شعبے سے وابستہ لوگوں نے کیا، معاشرے کی اصلاح

کے لیے، اجتماعی امور اور خدمت خلق کے لیے، تعلیم وتربیت کے شعبے میں اور محلے وبستی میں دینی زندگی کے احیاء کے لیے اس طرح کی علمی، تجربات پر مشتمل اور قابل عمل تجاویز تیار کی گئیں۔ اب اس کے لیے صفہ مجلس علمی کے نام سے الصفہ ٹرسٹ برائے تحقیق وتعلیم، لاہور کے زیر اہتمام اس کام کی تدوین وانضباط کا کام جاری ہے۔ الصفہ مجلس علمی ابھی تک اس کام کی طباعت کا ارادہ نہیں رکھتی لیکن جہاں ضرورت ہو، ہر موضوع پر مرتبہ رپورٹ متعلقہ حلقے، گروپ یا فرد کو مہیا کردی جاتی ہے۔ ہمیں بھی انہوں نے ساری رپورٹوں کی کاپی عنایت فرمائی۔

یہ ایک عظیم کام ہے جو تبلیغی جماعت، حسب عادت، خاموشی سے، بغیر کسی پروپیگنڈے کے، کررہی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس کام میں برکت دے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان احباب میں سے کسی نے ہمیں ایک دفعہ بھی یہ احساس نہیں دلایا کہ تبلیغی جماعت کے منہج پر ہماری فکری تنقید غلط تھی، بے خبری پر مبنی تھی اور یہ کام تو وہ برسوں سے کررہے ہیں بلکہ ان کا لہجہ وہی عاجزانہ تھا کہ ہم تو آپ کو اپنا سبق سنانے آئے ہیں، ہم اس بڑے کام کے اہل نہیں وغیرہ وغیرہ۔ اہل تبلیغ کی یہ تواضع اور عاجزی اپنی جگہ قیمتی سہی لیکن ہمارے خیال میں انہیں کم ازکم دنیا کو باخبر تو کرنا چاہیے کہ وہ صرف لوگوں کے کلمے ہی سیدھے نہیں کرارہے بلکہ معاشرے کی اجتماعی اصلاح کے لیے بھی جدوجہد کررہے ہیں۔

ان کے کام کا تجزیہ، اس کے اثرات، اس میں بہتری کی تجاویز یا ان کے ساتھ ہمارے تعاون کے امکانات کی بحث ہم اگلی نشست تک مؤخر کرتے ہیں۔ ان پر بے خبری میں کی گئی تنقید پر ہم شرمندگی محسوس کرتے ہیں اور ان کا یہ کام عوام کے سامنے لانے کی کوشش بھی ہم، ان شاء اللہ، ضرور کریں گے۔

داستان سرائے　　　ادارہ

دلچسپ و سبق آموز واقعات

ایک تھا ثمامہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مسجد میں تشریف لائے۔ دیکھا ایک کڑیل جوان، خوش لباس، نڈر مسجد کے ستون سے بندھا ہوا ہے (قریش مکہ چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے پر تلے بیٹھے تھے لہٰذا آپ نے ایک فوجی دستہ یمامہ کے علاقے کی طرف بھیجا تھا۔ دشمن کے علاقے میں ان کی مڈھ بھیڑ ثمامہ سے ہوگئی۔ انہوں نے اسے قیدی بنالیا، مدینہ لے آئے اور مسجد کے ستون سے باندھ دیا)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم: آپ کون ہو؟

ثمامہ: میں ثمامہ بن اثال ہوں، یمامہ کا سردار، عمرے کو جارہا تھا کہ آپ کے لوگوں نے پکڑلیا۔ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ سے پوچھا: ان کو کوئی تکلیف تونہیں دی انہوں نے کہا: نہیں، صرف باندھا ہے)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم: پھر آپ کا کیا کیا جائے؟

ثمامہ: اگر آپ نے مجھے قتل کیا تو میرا قبیلہ زور آور ہے بدلہ لے گا۔ چھوڑ دیں گے تو احسان مند ہوں گا اور اگر فدیہ لینا ہے تو بتائیں مال دار آدمی ہوں، ادا کردوں گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ سے کہا: ان کی تکریم کرو۔ کوئی تکلیف نہ ہو اور سوچتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ دوسرے دن آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پھر ثمامہ سے حال احوال پوچھا اور اس نے پھر وہی تین باتیں دہرائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ کو پھر تلقین کی کہ قیدی سے حسن سلوک کرو۔ اسے کوئی تکلیف نہ ہو اور آگے بڑھ گئے۔

ثمامہ مسلمانوں کے حسن سلوک، ان کے مل کر عبادت کرنے، ایک دوسرے کے ساتھ

محبت واخوت اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے ساتھیوں کو بار بار تاکید کرنے کہ اسے کوئی تکلیف نہ ہو، سے متاثر ہو رہا تھا۔ تاہم منتظر تھا کہ آپ اس کے بارے میں کیا فیصلہ کرتے ہیں۔

تیسرے دن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد تشریف لائے اور ثمامہ سے پھر وہی مکالمہ ہوا تو آپ نے صحابہ سے فرمایا۔ اس کی رسیاں کھول دو، اسے آزاد کردو اور عزت سے رخصت کردو۔ ثمامہ آزاد ہوا اور مدینہ سے روانہ ہوگیا لیکن وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسن سلوک سے بہت متاثر تھا۔ اسے معلوم تھا کہ عرب میں قیدیوں سے کتنا بدتر سلوک ہوتا تھا لیکن اس کی تو بہت عزت کی گئی تھی۔ اس نے سوچا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سچا ہے اور اس کا دین بھی۔ چنانچہ اس نے اسلام لانے کا فیصلہ کرلیا۔ قریبی نخلستان میں گیا، نہایا دھویا، اونٹوں کا پیٹ بھرا اور واپس مدینہ آیا۔ مسجد نبوی پہنچا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ لوگ حیران ہوئے کہ اسے آزاد کیا گیا تھا لیکن وہ پھر واپس آگیا۔ اس نے کہا میں مسلمان ہونے آیا ہوں اور کلمۂ شہادت پڑھا۔ مسلمان فرطِ مسرت سے جھوم اٹھے اور اس سے مصافحہ ومعانقہ کرنے لگے، اسے مبارکباد دینے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی بہت خوش ہوئے۔

ثمامہ: یارسول اللہ! میں آپ کا اور اسلام کا دشمن تھا۔ آپ کے آدمیوں نے قیدی بنایا تو یہ نفرت بھڑک اٹھی۔ آپ کے چہرے، آپ کے دین اور آپ کے شہر سے بدتر اور قابل نفرت میری نظر میں کوئی چیز نہ تھی لیکن آپ کے حسن سلوک نے میرا دل جیت لیا۔ اب آپ کا چہرہ، آپ کا دین اور آپ کا شہر مجھے ساری دنیا سے زیادہ محبوب ہے اور میں خود کو دنیا کا سب سے خوش قسمت فرد تصور کرتا ہوں کہ آپ کی وجہ سے مجھے یہ نعمتیں ملیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جاؤ عمرہ کرو اور خوش رہو۔ اللہ نے تمہارے اگلے پچھلے گناہ معاف کردیے ہیں۔

ایک لوہارکی عبداللہ

کیااس ملک میں اسلام کا کوئی والی وارث ہے؟

کیااس ملک میں اسلام کا کوئی والی واث ہے؟ ہمارا جواب ہے **نہیں!** کیونکہ:

* ہمارے ملک کے حکمران طبقے (سیاستدان، عدلیہ،فوج، بیوروکریسی وغیرہ) مغرب زدہ اور سیکولر ولبرل ہیں۔ انہیں صرف اپنے ذاتی،طبقاتی اور مادی مفادات عزیز ہیں اوران کے تحفظ کے لیے وہ مغربی ممالک کی اشیر باد اور مغربی فکروتہذیب کی اقتداء کو کافی سمجھتے ہیں۔ اسلام کا تصوران کے ذہن میں صرف اتنا ہے کہ اسلام کا نام لینا ہے کیونکہ ملک میں اکثریت مسلمانوں کی ہے جو جذباتی طور پر شدت سے اسلام سے اپنی وابستگی کا اعلان واظہار کرتے ہیں۔خود بھی وہ اظہار اسلامیت کے لیے کچھ مظاہر اور رسوم سے وابستگی ظاہر کرتے ہیں جیسے مسجد میں نماز پڑھنے کی یا حج وعمرہ پہ جانے کی فوٹو کھنچوانا،میلا دمنانا وغیرہ۔

* علماء کے نزدیک ان کا مسلک اور فرقہ ہی سب کچھ ہے۔ اس مسلک اور فرقے سے ان کی وابستگی اوراس وابستگی کے نتیجے میں حاصل ہونے والے مفادات کے مقابلے میں 'دین' بیچارہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ مسجدیں اور مدرسے ان کی اس فرقہ واریت کے مرکز اور گڑھ ہیں۔

* دینی سیاسی جماعتوں کے نزدیک 'اسلام' سے زیادہ 'اسلام آباد' اہم ہے۔ اسلام آباد پہنچنے کے لیے اسلام محض ایک ٹول،نعرہ اور ذریعہ ہے۔ اگر انہیں 'اسلام' عزیز ہوتا تو وہ نفاذ شریعت کے لیے متحد نہ ہوجاتے؟

مولانا فضل الرحمن اور پروفیسر ساجد میر اس وقت ایک سیاسی محاذ کے ساتھ مل کر جوجدوجہد کررہے ہیں کیا وہ اسلام کے لیے ہے؟ ہرگز نہیں۔ مولانا فضل الرحمن کو غصہ اس بات پر ہے کہ پچھلے ۱۳ سال سے وہ جس اقتدار کا مزہ لوٹ رہے تھے موجودہ سیاسی سیٹ اپ نے اسے جاری کیوں نہیں رکھا؟ پروفیسر ساجد میر صاحب کا مفاد صرف اتنا ہے کہ اس مسلم لیگ (ن) کا نمک حلال کریں جس کی مہربانی سے انہیں ایک دو نشستیں ہمیشہ اسمبلیوں میں مل جاتی ہیں اوران کی جماعت اہل حدیث کا نام ریکارڈ پر آجاتا ہے اورانہیں اس کی نمائندگی کا شرف حاصل ہوجاتا ہے۔

عوام دین پر عمل کیوں نہیں کرتے یا دینی جماعتوں کو ووٹ کیوں نہیں دیتے؟ اس پر سوچنے کا وقت بھی کسی کے پاس نہیں ہے۔ رہے نام اللہ کا۔